خاک ہو جائینگے ہم.....!
(ناول)
ابراہیم اختر

خاک ہو جائیں گے ہم.....!

(ناول)

از

ابراہیم اختر

نام کتاب: خاک ہو جائیں گے ہم۔!

مصنف: ابراہیم اختر

اشاعت: سنہ ۲۰۱۱ء

ناشر: تزئین پبلیکشن

کمپیوٹر کمپوزنگ، طباعت: انصاری پرنٹرس، قدیم مونڈھا پربھنی

سرورق: محمد نصیر انصاری

قیمت: ۱۵۰/روپیئے

دستیاب: ۱) فسانہ بلڈنگ، یوسف کالونی، پربھنی۔ ۴۳۱۴۰۱

۲) اسباق پبلیکشن، سائرہ منزل ۲۳۰/بی/۱۰۲ اویمان درشن، سنجے پارک لوہگاؤں روڈ، پونہ ۴۱۱۰۳۲ (مہاراشٹر) انڈیا

۳) انصاری پرنٹرس، قدیم مونڈھا، پربھنی۔ ۴۳۱۴۰۱

۴) روزنامہ ورقِ تازہ، اسماعیل مارکٹ، ناندیڑ

انتساب

اپنے ہمدمِ دیرینہ

جناب رشید انجینئر کے نام جو

خورشیدِ درخشاں کی صورت

پربھنی کی سرزمین پر علم کی

روشنی پھیلا رہے ہیں

ابراہیم اختر

(۱)

☆☆

چھوٹی بہن کی شادی کے لئے اس نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ اس شادی پر وہ اتنی خوش تھی کہ اس کے اپنے اندر پھیلتی ہوئی ویرانی کو اس نے چھونے کی بھی کوشش نہیں کی۔ پورے انتظامات خود اپنی نگرانی میں کئے۔ بابا خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ ان کی بیٹی نے بیٹے کی کمی پوری کر دی ہے۔ اس نے بابا کو کبھی یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ ان کے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ وہ ان کی سب سے بڑی لڑکی تھی جس نے پورے گھر کی کفالت کا بوجھ اپنے سر لے رکھا تھا۔ پہلی دو بہنوں کو پڑھا لکھا کر ان کے ہاتھ پیلے کر دیئے تھے۔ تب اسے تنہائی کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن تیسری بہن نے جاتے جاتے اس

کے احساسات کی زمین میں تنہائی کے بیج بو دیئے تھے۔ جس لڑکے سے اس کی بہن بیاہی گئی تھی۔ اس نے زندگی کے کسی انجان لمحے میں اس کے دل کے دروازہ پر دستک دی تھی۔ اور وہ چپکے ہی چپکے اپنے آپ سے بھی ڈرتے ہوئے اسے چاہنے لگی تھی۔ لیکن دل کی وادی میں قدم رکھنے بھی نہ پائی تھی کہ چھوٹی بہن سامنے آ کھڑی ہوگئی۔ وہ سہم کر خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی اور اپنے اندر اٹھنے والی چیخ کو دبا دیا۔ کمھلائے ہوئے چہرے پر دوسرا چہرہ چڑھا لیا۔ رشتے کی بات چلی تو فوراً اپنی رضامندی ظاہر کردی اور شادی کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہوگئی۔ دلہن بننے کے اپنے خواب کو تہہ کر کے رکھ دیا۔

بہن کی شادی پر دل کھول کے خرچ کیا۔ ماں باپ اس کی فراخ دلی پر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ کبھی اس نے بھی اپنے دل کی بستی بسانے کی کوشش کی تھی جو بستے بستے اجڑ گئی۔ جس کا اجڑنا کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ خود بھی انجان بننے کی کوشش کرتی رہی۔

وہ شادی کے انتظامات میں اتنی مصروف رہی کہ بہن کو عروسی جوڑے میں دیکھنے کے لیئے نہیں جا سکی۔ اور نہ کسی نے اس جانب توجہ دی۔ شادی کے ہنگاموں میں کسے فرصت تھی کہ اس کے دل کی تختی پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ سکے۔ وہ خود بھی اپنے آپ سے چھپی چھپی رہی کہ اسے اپنی پرچھائیں سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ جب جُدائی کا وقت آیا تو وہ بہن سے لپٹ گئی اور اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے آتے تھے۔ آنسوؤں کے سیلاب نے ضبط کے سارے بند توڑ ڈالے۔ آخری بار اس نے دولہا پر نظر ڈالی اور خاموشی سے اپنے کمرہ میں چلی آئی۔

(۴)

☆☆

دو چار دن خاموشی سے گزر گئے۔اس عرصہ میں وہ خاموش خاموش ہی رہی۔کوشش کے باوجود ماں باپ سے کھل کر بات چیت نہیں کرسکی۔اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھ کر دل کی ویرانی کے کرب سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔شاید وہ دوسرں کے لیئے ہی پیدا ہوئی تھی۔اپنے آپ میں جینا اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔کیوں کہ زندگی اس کی اپنی نہیں تھی۔زندگی نے اسے کچھ دیا ہی نہیں تھا۔اس نے اپنی زندگی کی ایک ایک پرت کھول کر دیکھی۔لیکن کوئی پرت اس کی اپنی نہیں تھی۔اگر اس کا اپنا کچھ تھا تو ایثار تھا اور بس۔وہ جو زندگی جی رہی تھی اس کے کسی لمحے نے اسے آواز نہیں دی تھی۔وہ اپنے وجود

(۵)

میں ایک سایہ دار درخت تھی جو صرف دوسروں کو راحت اور سکون دیتا ہے۔ اسے اپنی سانسوں پر بھی شاید اختیار نہیں تھا۔ اس کا وجود مختلف خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ لیکن کسی خانہ پر بھی اس کا اپنا ادھیکار نہیں تھا۔ وہ پتھر کا ایک مجسمہ بننے کی کوشش کر رہی تھی جو نہ سن سکتا نہ دیکھ سکتا اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔ بس اپنے آپ میں سمٹا زمانے کے سرد و گرم سہتا رہتا ہے۔ جس کی رگوں میں نہ خون گردش کرتا ہے نہ زندگی سانس لیتی ہے۔ نہ سینے میں دل دھڑکتا ہے۔ نہ آنکھوں میں آنسوؤں کی جوت جلتی ہے جوت جلے بھی تو کیسے جب کہ خود اس نے اپنے اندر کی جوت کو بجھا دیا تھا۔

☆☆

کمرہ سے باہر آ کر اس نے بابا کی طرف دیکھا جو چھلنگنی چارپائی پر لیٹے آسمان کو تکے جارہے تھے ان کے لیئے بس یہی ایک کام رہ گیا تھا۔

بے رحم آسمان نے کسے کیا دیا ہے جو انہیں دے گا۔اس نے ذرا رک کر ان کے مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھا اور کھنکارتے ہوئے کہا۔

''بابا''۔

''ہاں بیٹی'' انھوں نے کروٹ بدلی تو بدن کا جوڑ جوڑ احتجاج کرنے لگا۔

''میں اسکول جارہی ہوں''۔اس نے تھمے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''اچھا بیٹی''۔

ایک لمحہ رک کر اس نے بابا کے چہرہ کو پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں کوئی تحریر نہیں تھی۔ان کی زندگی کی طرح ان کا چہرہ سپاٹ اور مرجھایا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اور نپے تلے قدموں سے سڑک پار کرنے لگی۔ بابا کا چہرہ کرم خوردہ بوسیدا صفحہ کی طرح اس کی نظروں میں تیرنے لگا۔ اس چہرہ پر ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں کے سوائے کچھ نہیں تھا۔ وہ کرچیاں اب اس کے وجود میں چبھنے لگی تھیں۔ بابا کے لیئے اس کے دل میں نہ محبت تھی نہ نفرت۔ کچھ ہی عرصہ پہلے مما چپکے سے ان کا ساتھ چھوڑ کر زمین کا پیوند ہو چکی تھی۔ بابا کے تعلق سے وہ اکثر سوچتی کہ انھوں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ پتہ نہیں ان کی کیا مجبوری تھی کہ اس کو اپنی زندگی جینے کا موقع ہی نہیں دیا۔ پھر سوچتی کہ اگر وہ اسے موقع دیتے تو وہ کہاں جاتے۔ کس کے رحم وکرم پر اپنے آپ کو چھوڑتے۔اس لیئے انھوں نے اسے بیٹی نہیں سمجھا ہمشہ اسے بیٹا ہی سمجھتے رہے۔کوئی رشتہ آیا بھی

تو کوئی نہ کوئی اعتراض کر کے انکار کر دیتے ۔ وہ اپنے آپ میں کتنے صحیح تھے یا کتنے غلط وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ۔ اور جب بھی فیصلہ کرنے کا وقت آیا اپنے آپ سے فرار اختیار کر لیا ۔ بابا جب بھی کسی رشتے کو مسترد کرتے اس دن چپ سادھے گھنٹوں چارپائی پر لیٹے آسمان کو تکا کرتے ۔ اس دن اسے لگتا جیسے سورج سوا نیزے پر آ کر رک گیا ہے ۔ وہ بابا سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی ۔ اور بابا بھی اس سے آنکھ ملانے سے کتراتے تھے ۔ وہ اپنے مستقبل کے تعلق سے سوچتی تو سہم کر رہ جاتی ۔ جانے وہ کیوں اس کے لیئے دیواریں کھڑی کر رہے ہیں ۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی ۔ وہ بابا پر غصہ کرنے کے تعلق سے سوچ بھی نہیں سکتی تھی غصہ آیا بھی تو کمرہ میں جا کر لیٹ جاتی ۔ تب بابا کا خزاں رسیدہ چہرہ نظروں میں تیرنے لگتا ۔ اور وہ سوچنے لگتی کہ بابا کے سوا اس کا دنیا میں کون ہے ۔ اور بابا کا اس کے سوا کون ہے ۔ وہی تو ان کا آخری سہارا ہے ۔ اگر اس نے بھی اپنا گھر بسا لیا تو وہ کہاں جائیں گے ۔ کس کے سہارے زندہ رہیں گے ۔ یہ ان کی خود غرضی نہیں مجبوری ہے ۔ اگر انھیں ایک بیٹا ہوتا تو وہ اسطرح مجھ سے ناانصافی نہ کرتے ۔

(۹)

ہائے میرے اچھے بابا تم نے بھی کیسی مجبور زندگی مانگی ہے خدا سے۔
اس دنیا میں تم جیسا مجبور انسان بھی کوئی ہوگا؟ جاؤ بابا میں نے اپنے
آپ کو تمہارے لیئے قربان کر دیا ہے۔ہم پر تمہارے کتنے احسانات
ہیں۔ ہاں! میں جانتی ہوں کہ کس طرح تم نے ہمارے لیئے اپنی
زندگی کو مٹی میں ملا دیا ہے۔تم نے ہمارے لیئے کیا نہیں کیا ہے۔
ہماری تعلیم کا خرچ کس کس طرح پورا کرتے تھے۔ زندگی کا بوجھ
ڈھوتے ڈھوتے تم وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔اب تو اٹھنے بیٹھنے
میں بھی تم کو تکلیف ہوتی ہے۔ایسے نازک وقت میں تمھیں سہارے
کی ضرورت ہے۔۔۔۔یہی کچھ سوچتے سوچتے ذہن بوجھل ہو جاتا
تو وہ بابا کے پاس بیٹھ کر پیار سے ان کے برف سے سفید
بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شیریں لہجہ میں کہتی۔

''کیا سوچ رہے ہو بابا؟''

''کچھ نہیں بیٹا، بس یوں ہی۔۔''

''اس طرح اپنے آپ میں بھٹکنا چھوڑیئے۔میرا ہاتھ تھام

کر ہنسی خوشی زندگی کا سفر طے کیجیئے۔ دیکھئے نا، میں کتنی خوش ہوں۔
چلیئے کھانا کھا لیجئے۔'' وہ مسکرا کر ان پر جھک جاتی۔

بابا اسے مجوب نظروں سے دیکھتے ہوئے خاموشی سے اٹھ جاتے۔ اور اٹھتے اٹھتے اندر ہی اندر اپنے آپ میں کہیں گم ہو جاتے۔
بابا کا اس طرح گم ہو جانا اس کے لیئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بھی تو شکستہ کشتی کی طرح طوفان خیز سمندر میں ادھر سے ادھر سر ٹکرا رہی تھی۔
اور کنارا ہے کہ نزدیک ہی نہیں آتا تھا۔

اس کی زندگی دو خانوں میں بٹ چکی تھی جس کا ایک سرا بابا کے ہاتھ میں تھا تو دوسرا سرا اس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ بابا نے جو سرا تھاما تھا وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے زیادہ دنوں تک تھام نہیں سکیں گے۔ کیوں کہ ان کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ اور چہرہ دھواں سا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ان کے جھریوں بھرے چہرہ کو پہچاننے کی کوشش کرتی۔ پتہ نہیں وہ بار بار کہاں کھو جاتے ہیں۔ کیوں اپنے آپ کو سنبھال کر نہیں رکھتے۔ وہ انھیں

سنبھالتے سنبھالتے تھکن محسوس کر رہی تھی۔ ریت کا گھر کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔ اور ایک دن ریت کا وہ گھروندا مہندم ہو گیا۔ اور ریت کے اس ملبے میں بابا بھی کہیں دب کر رہ گئے۔ ورنہ وہ اس طرح پاش پاش نہ ہوتے۔ خود تو پاش پاش ہو گئے اور اسے بھی چکنا چور کر دیا۔ اس کے اندر کا سورج رک رک کر غروب ہو رہا تھا۔ بابا کبھی بھولے سے ہنستے بھی ہیں تو لگتا ہے جیسے اندر سے رو رہے ہوں۔

☆☆

شہنائی کی مدھر اور سریلی آواز سے اس کے سراپا میں شیرینی گھل رہی تھی۔ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس وہ مستقبل کے سنہری خوابوں کو چن رہی تھی۔ خوشبوؤں کے نقش قدم دل کے آنگن میں مخملی چاندنی میں جگمگا رہے تھے۔ گھونگٹ کی اوٹ سے نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا۔ گھر کے در و دیوار پر روشنی مسکرا رہی تھی۔ ڈولی دل کے دوار سے لگ چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اسے بابل کا گھر چھوڑ کر زندگی کا نیا سفر طے کرنا ہوگا۔

چھوڑ بابل کا گھر۔۔۔

اس کے کانوں میں گیت کے میٹھے بول

گونج رہے تھے۔ جن میں مسرتیں بھی تھیں۔ آنسوؤں کے پھول' بابل سے جدائی کا کرب اور وصال کی لذت بھی تھی۔ سہیلیوں نے گھونگھٹ الٹ کر چھیڑا تو وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔

ہائے بنّو ہم سے شرمارہی ہو تو۔۔۔ان کا سامنا کیسے کروگی۔۔۔؟

دلہنیا! ہمیں بھولنا نہیں

اے نوج پیا کے گھر جا کر طوطا چشم نہ ہو جانا

ہائے دیکھو تو آنکھیں ابھی سے انھیں ڈھونڈھ رہی ہیں

بھئی ہم بھی کبھی دلہن بنے تھے۔۔۔لیکن اتنے بے صبرے نہیں تھے۔

اے رہنے دے ہم کا سب معلوم ہے۔

ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔

پیا کانے ہیں کیا؟

ہی ہی ہی۔۔۔۔۔

تیرے منہ میں خاک۔۔۔

کیوں جل کر کباب ہو رہی ہے!

ارے بھائی تیرے بھی نصیب جاگیں گے۔۔۔

ہاں ہاں۔

کیوں نہیں۔

دبے دبے ہونٹوں میں گونجتی ہوئی نُقرئی ہنسی کی پُھلجھڑیاں ' بے ساختہ قہقہے ' مسکراہٹوں کی چلمن کی اوٹ سے وہ سہیلیوں کے نکیلے فقروں کو سن رہی تھی۔ اور ڈھولک پر گائے جانے والے گیتوں کے ترنم سے اس کا انگ انگ تھرک رہا تھا۔ شہنائی کی سریلی آواز خواب کا سا سماں باندھ رہی تھی۔۔۔ وہ پھولوں سے سجی مسہری پر سر جھکائے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بابا اکیلے رہ جائیں گے۔ اسے عروسی جوڑے میں جی بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ دیکھنے کی تاب بھی کہاں ہوگی۔ میں نے بھی تو جی بھر کر انھیں دیکھا نہیں۔ اگر دیکھ لیا ہوتا تو جانے کہاں سے ٹوٹ جاتی۔ وہ پتھر ہی بن گئے ہیں زندگی بھر اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہے۔ وہ خود بھی

تو اپنے آپ کو دھوکہ دیتی رہی ہے۔قسمت نے کیا اچھا مذاق کیا ہے ہمارے ساتھ۔اور اب دونوں ایک ساتھ داؤ پر لگ گئے ہیں۔میرے اچھے بابا!۔تمھارے لیئے اب کھانا کون پکائے گا۔کپڑوں پر استری کون کرے گا۔وقت پر دوا کون دے گا۔تمہارے آگے پیچھے اب کون ہے بابا؟۔۔۔۔۔۔ سوچتی ہوں تمہیں اپنے پاس رکھ لوں ۔لیکن۔۔پتہ نہیں وہ گوارا کریں گے یا نہیں؟ ہاں کیا پتہ! ۔۔۔گھونگھٹ کو سنبھال کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ بھاری قدموں کی آہٹ سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔اور وہ بیر بہوٹی کی طرح اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ جی اوپر نیچے ہونے لگا۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ہائے اب کہاں جاوں ۔۔۔۔۔۔وہ آرہے ہیں۔

نزدیک۔نزدیک۔اور نزدیک۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔۔

بابا نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔پتہ نہیں وہ جاگ رہی تھی یا سو رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹی ۔طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' بابا نے بے تابی سے پوچھا۔اس نے بابا کو غور سے دیکھا۔ وہ اب تک کہاں تھی؟ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی؟

''کیا بارات چلی گئی بابا؟'' اس نے بابا کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کیوں؟''

''ایسے ہی پوچھ لیا'' وہ اپنے آپ کو بابا سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

'کچھ اور کہنے سے پہلے وہ فوراً اس کے سامنے سے یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔

''دلہن کے ابا بہت رو رہے تھے نہ بے چارے بابا اس سے نہ کچھ چھپا رہے تھے نہ وہ اپنا درد دکھا پا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور دور اپنے اندر ٹوٹی پھوٹی زندگی جی رہے تھے۔ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔بابا پھر بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیتے۔ لیکن وہ قدم قدم پر ڈگمگا جاتی۔لیکن وہ زندگی سے سمجھوتا کرنے کے لیئے

مجبور ہو گئی۔ سمجھوتہ نہ کرتی تو بابا آنکھوں کی روشنی کس سے مانگتے۔ وہ تو اتنے مجبور ہیں کہ اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ابھی ابھی بات ادھوری چھوڑ کر وہ اس کے سامنے سے چلے گئے تھے۔ اس نے صرف اتنا ہی پوچھا تھا کہ۔۔۔

''کیا بارات چلی گئی۔۔۔''

جب سے محلّہ میں رہنے والی ایک لڑکی کی شادی کی ہماہمی شروع ہوئی تھی۔ اس نے مہندی سے اپنے ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے تھے۔ بابا خاموشی سے اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو رہ رہ کر دیکھتے تھے۔ اور جب وہ اس کی طرف دیکھتے تو وہ ہاتھوں کو چھپانے کی کوشش کرتی اور کترا کر ان کے سامنے سے نکل جاتی۔ بارات جانے کا وقت آیا تو وہ آنکھوں کے کواڑ بند کر کے خوابوں کے جزیرہ میں اتر گئی۔ اور جب بابا نے اسے جگایا تو خوابوں کا وہ جزیرہ سمندر کی تہہ میں ڈوب گیا۔ کیوں کہ بابا نے ایک اور رشتہ کو واپس کر دیا تھا۔ اور تب سے وہ موم کی طرح اندر ہی اندر پگھل رہے تھے۔ اور زمین کو چھوڑ کر جانے

کیا آسمان میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جب کچھ کھویا ہی نہیں تو کیا ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کھویا تو میں نے اپنا سب کچھ۔ صرف ان کی خاطر بابا کی زندگی کا کھویا ہوا سرا اس کے ہاتھ لگا اور ان کی اداس آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سائے اس کے وجود میں پھیلنے لگے۔ اس کے دل میں ہمدردی ابل پڑی۔ اور اس کی بدگمانی محبت میں ڈھل گئی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ان مراحل سے گزر کی تھی۔ لیکن اس تبدیلی نے اسے پوری طرح بدل کر رکھ دیا۔ اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ان سے لپٹ کر آنسوؤں کا پورا خزانہ اُن کے قدموں میں انڈیل دے۔ تاکہ آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی اس کی آنکھوں میں باقی نہ رہے۔ کیوں کہ ان آنسوؤں کا کوئی مول نہیں تھا۔ جس چیز کی کوئی قیمت نہ ہو وہ زندگی کو بھی بے وقعت بنا دیتی ہے۔۔ جانے کب ان کا ساتھ چھوٹ جائے۔ اس خوف کے احساس نے اسے تڑپا کر رکھ دیا۔ اور وہ قدم قدم پر انھیں سنبھالنے لگی۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کے حوالہ کر دینا چاہتی تھی۔ ان کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر اسے یہ ڈر لگا

(۱۹)

رہتا کہ وہ کسی وقت بھی اسے بتائے بنا اٹھ کر جا سکتے ہیں۔اس کا یہ خدشہ کچھ بے جا بھی نہیں تھا۔کیوں کہ سوکھا ہوا پتہ کبھی بھی اپنا رشتہ درخت سے توڑ سکتا ہے۔ وہ زندگی کا کافی طویل فاصلہ طے کر چکے تھے اور آخری پڑاو کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔یہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کی شاید انھیں بڑی جلدی تھی۔

☆☆

دونوں کو زندگی میں کچھ اور حادثوں کو جھیلنا تھا۔ دو مہینوں کے فرق سے دونوں چھوٹی بہنیں انتقال کر گئیں ۔ یہ سانحہ اس نے کسی نہ کسی طرح جھیل لیا۔ لیکن بابا بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئے ۔ ہائے کہہ کر چارپائی سے لگے تو چارپائی کے ہو کر رہ گئے ۔ اس نے بہت چاہا کہ بابا اس حادثے کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں ۔ لیکن ان میں اتنی سکت کہاں تھی ۔ یہ حادثہ ان کے لیئے بڑے جان لیوا تھا۔ وہ جھیلتے بھی تو کیسے ۔ ایک بہن کے کوئی اولاد نہیں تھی ۔ دوسری کو ایک لڑکا تھا اس بہن

کے شوہر نے اپنے خسر سے اس کا رشتہ مانگا تھا بابا کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے خود انکار کر دیا۔ کیوں کہ وہ اس کے مزاج اور رویہ سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے بیوی کے ساتھ اکثر زیادتی کی تھی۔ اس کی طرف سے جواب ملنے پر اس نے دوسری جگہ شادی کرلی۔ شادی کے نتیجہ میں اس کا بھانجا اور بھی بے سہارا ہو گیا۔ اس نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ بچے کے باپ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ بابا تو اُس کی محبت پا کر جی اٹھیں گے۔ اسے دیکھ کر شاید وہ اپنا غم بھول جائیں۔ لیکن ان کو ایسی چپ لگ گئی کہ کچھ بولتے ہی نہ تھے۔ جیسے گونگے ہو گئے ہوں۔ نہ کھانا وقت پر کھاتے نہ وقت پر سوتے۔ راتوں میں اٹھ اٹھ کر بے چین سے ٹہلنے لگتے۔ اس نے ان کی دلجوئی کے لاکھ جتن کئے لیکن ان کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ دل میں دکھ کی آندھی زیادہ ہی اٹھنے لگی تو باہر نکل جاتے۔ ایک دن ان کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ بابا کی حالت دیکھ کر وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ فوراً ڈاکٹر کو لے آئی۔ ڈاکٹر نے معائینہ کرنے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان کے دل پر بہت بڑا صدمہ ہے۔ایسا صدمہ اس عمر میں ان کے لیئے۔۔۔بہر حال انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیجئے۔اور میں دوائیں لکھ دیتا ہوں۔انھیں وقت پر اور پابندی سے کھلائیے۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد نسخہ کا کاغذ ہاتھ میں لیئے وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بابا آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بو کو اشارہ سے قریب بلا کر آہستہ سے کہا۔

''بو تم ذرا نانا جان کے پاس ہی رہنا۔میں دوائیں لے کر جلد آتی ہوں۔''

بابا نے جینے کی آس جیسے چھوڑ ہی دی تھی۔کوئی بھی دوا اثر نہیں کر رہی تھی۔ دن بدن حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ان کی بیماری نے اسے نڈھال کر دیا۔اس کو دن اور رات کا کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔وہی اس کے لیئے ایک سہارا تھے ان کے لیئے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔گو بابا نے اسے کچھ دیا نہیں تھا۔بلکہ اس سے سب کچھ لے لیا تھا۔پھر بھی اس نے انھیں اپنی جان سے زیادہ چاہا تھا۔ انہی کی وجہ سے اس کے جسم و جان میں زندگی سانس لیتی تھی۔

ان کی حالت دیکھ کر وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کی شام قریب ہے۔ پھر بھی اس کے دل میں امید کی آخری کرن باقی تھی۔ اس نے شہر کے ہر چھوٹے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ بے دریغ پیسہ صرف کیا۔ تنخواہ ناکافی ہونے لگی تو راتوں کو کپڑے سینے لگی۔ گھر اور ببو کے اسکول کا خرچ مکان کا کرایہ .دواؤں کا خرچ۔ وہ اکیلی سارے مسائل سے نبرد آزما تھی۔ رات اور دن کام کرنے سے اس کی صحت بھی نرم گرم رہنے لگی۔ لیکن اس نے کوئی پروانہیں کی۔ اتنا سب کچھ کرنے پر بھی پیسوں کی کمی ہونے لگی تو اس نے اپنے وہ زیورات بھی بیچ ڈالے جو اس نے اپنے لیئے بنا رکھے تھے۔ یہ سوچ کر کے جب وہ دلہن بنے گی تو وہ زیورات پہنے گی۔ لیکن اب وہ زیورات اس کے کسی کام کے نہ تھے۔ فروخت کرنے سے پہلے اس نے تنہائی میں زیورات پہن کر دیکھا تو دو آنسو پلکوں سے ڈھلک گیئے۔ وہ سچ مچ ہی دلہن لگ رہی تھی۔ آنسو پونچھتے ہوئے سوچنے لگی کہ کیا دلہن ایسی ہی ہوتی ہے؟ جس نے ایجاب وقبول کے میٹھے بول

سنے تھے۔ نہ شہنائی پر سریلی آواز نہ ڈھولک کے وہ گیت سنے تھے جو
جسم کو گرما دیتے ہیں۔ زیورات اتارتے ہوئے وہ بے اختیار رو
پڑی۔ زیورات اتارنے کے بعد اس نے آئینہ میں اپنے سراپا کو دیکھا
تو اسے لگا جیسے وہ بے روح کا ڈھانچہ ہے۔۔ اس نے زیورات کو
ڈبے میں رکھا اور آنسو پونچھ کر باہر نکل گئی۔

زیورات کی پوری رقم علاج پر صرف ہو گئی۔ لیکن بیماری میں
کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔ چھ فٹ کے لحیم
شحیم بابا سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے جسم پر گوشت نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی
ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئے۔ بابا کی زندگی اس کو بے حد عزیز تھی
۔ کیوں کہ ان کے زیرِ سایہ وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھی۔ ورنہ تو اپنی
بے ثمر زندگی سے مایوس ہونے لگی تھی۔ کبھی دھوپ کبھی چھاوں۔ جیسے
زندگی میں وفا کی خوبو ہی نہ رہی ہو۔ بابا کی بیماری کا بوجھ ڈھوتے
ڈھوتے وہ نڈھال ہونے لگی تھی۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ
اس کی زندگی کہاں سے شروع ہوئی کہاں جا کر ختم ہو گی۔ کیوں کہ بابا نے

اسے کبھی سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ زندگی کے محور پر گھومتی رہی۔ اس لیئے کہ اس کا اپنا کوئی محور نہیں تھا۔ لیکن اس کی توجہ کا مرکز ٹوٹنے کے قریب تھا۔ لگتا تھا جیسے بابا زندگی سے رشتہ توڑنے کے لیئے پر تول رہے ہیں۔ ان کی صحت کے بارے میں اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ناگہانی پریشانی کو وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ بہت ہوتا تو تنہائی میں چپکے چپکے رو لیتی۔ رونا جیسے زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی آنکھیں روتیں کبھی دل روتا۔ اور کبھی اس کے ساتھ گھر کے در و دیوار بھی رونے لگتے۔ کبھی بھولے سے ہنسنے کی کوشش کرتی تو دل کا درد تڑپا دیتا۔ اور سارے وجود میں دراڑیں پڑنے لگتیں۔ جیسے زلزلے کا منبع اس کے اندر ہی کہیں کروٹیں لے رہا ہو۔ تین دن سے بابا نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ اور جب سورج غروب ہونے کے قریب تھا ذرا آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ گہری سانس لی اور خاموش ہو گئے۔

☆☆

بابا اس سے بغیر کچھ کہے اس دنیا سے چلے گئے۔اور اسے دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا۔ انھوں نے اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ جانے اب وہ کیسے اتنے کٹھور ہو گئے کہ چپکے ہی چپکے اسے تنہائی کے عذاب میں مبتلا کر گئے۔ وہ تھے تو اسے بڑی ہمت تھی ۔ سر پر چھت کا سایہ تھا۔ لیکن وہ چھت اب مہندم ہو چکی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کاش وہ بھی اس کے ملبے میں دفن ہو گئی ہوتی۔ بابا کے بغیر اس کی زندگی غم کا الاؤ بن کر رہ گئی تھی۔ غموں کا پہاڑ ٹوٹنے پر بھی اس نے بٹو کے سامنے بہت ضبط کے ساتھ آنسوؤں کو روکے رکھا۔ کیوں کہ وہ بٹو کے ننھے

(۲۷)

سے دل میں درد کی چنگاری رکھنا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ ابھی وہ چھ سال کا چھوٹا بچّہ تھا۔ دل کے زخموں کو سوگوار مسکراہٹ کے عقب میں چھپاتی رہتی تھی۔ کیوں کہ وہ اسے اداس دیکھ کر بجھ کر رہ جاتا تھا۔ اور وہ اسے اداس دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے طے کرلیا کہ ببّو کی خاطر اسے اپنی زندگی کا عنوان بدلنا پڑے گا۔ اس نے بھولی بسری مسکراہٹ کو اپنے چہرہ پر ٹانک لیا۔ بظاہر دکھوں کے بوجھ کو کہیں دور بہت دور پھینک آئی۔

☆☆

وہ ہر روز مقررہ وقت پر اسکول جایا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے گھر سے نکلنے میں تھوڑی سی دیر ہوگئی وہ گھر سے نکل کر تیز قدموں سے اپنے مخصوص راستے پر چلنے لگی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے شخص پر پڑی۔ ایک لمحہ کے لیئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے اپنے راستے پر چلے گئے۔ لیکن وہ ایک لمحہ جہاں ان کی نظریں ملی تھیں وہیں تھم گیا۔۔۔اسکول پہنچ کر اس نے حاضری رجسٹر پر دستخط کیئے اور کلاس میں چلی گئی۔ بچوں کو روز کی طرح پڑھایا اسکول چھوٹنے پر گھر آ گئی۔ اس کے روز کے معمول میں کوئی

فرق نہیں آیا۔ جیسے وہ کوئی اتفاقی بات تھی، جو آئی گئی ہو گئی۔ دوسرے دن وہ ٹھیک وقت پر گھر سے نکل گئی۔ راستے میں اسی مقام پر پھر ان کا سامنا ہو گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر اسے دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ اس اجنبی شخص نے بھی ایک نظر غور سے اسے دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ جب اس کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گیا تو اسے اپنے قدم بھاری سے لگے۔ اس نے رفتار تیز کر دی اور اسکول پہنچ کر گلاس بھر کر ٹھنڈا پانی پیا۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ جیسے تیسے اس نے اپنے فرائض انجام دیئے لیکن آج اس کے روز کے معمول میں تھوڑا سا فرق پڑ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے رویہ سے کچھ ظاہر ہونے نہیں دیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔لیکن کچھ ہوا ضرور تھا۔ جسے وہ محسوس کرتے ہوئے بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے روزمرہ کے کاموں میں کچھ نہ کچھ بھول ضرور ہو رہی ہے۔ دل کے اندر کہیں تھوڑی سی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ اور اس گڑ بڑ نے اسے احساس دلایا کہ اس کے سینے میں بھی ایک دل ہے۔ایک ایسی بستی جو بستے بستے بستی ہے۔

☆☆

دن گذرتے رہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموشی سے گذرتے رہے۔ وہ اس کی نظروں کے مفہوم کو پڑھ کر بھی انجان بننے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ اپنے دل کا دروازہ مضبوطی سے بند کرلینا چاہتی تھی۔ کیوں وہ محسوس کررہی تھی کہ اب پیچھے مڑکر دیکھنا ممکن نہیں ہے۔اس لیئے کہ وہ پیچھے بہت سارا اثاثہ کھوکر آئی تھی۔ کھوئی ہوئی چیزیں کسے ملی ہیں جو اسے ملیں گی۔ وہ بالکل تہی دست ہو چکی تھی۔ اب اس کے پاس کسی کو کچھ دینے کے لیئے بچا ہی کیا تھا۔ راستے میں ملنے والے نے اس سے کچھ مانگا نہیں تھا۔ صرف نظر بھر کر اسے دیکھتا

اور گالوں میں مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس سے کچھ طلب کر رہی ہیں۔کوئی چیز اسے اندر ہی اندر سے جھنجھوڑ رہی تھی۔اس کو اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔اس نے راستہ بدل دیا۔لیکن نیا راستہ اسے راس نہیں آیا۔ اسے لگا جیسے نیا راستہ جانے کہاں پہنچادے۔اور تیسرے ہی دن وہ پھر پرانے راستے پر قدم بڑھا رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اس سے قریب آرہا تھا۔اس کی رفتار دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کے قریب آیا اس کے کانوں سے ہلکی سی آواز ٹکرائی۔

''ہیلو۔''

ہیلو کی آواز کے ساتھ ہی اس کے سارے بدن میں چینوٹیاں سی رینگنے لگیں۔اور جیسے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی ساری تمازت اس کے وجود میں پھیل گئی ہو۔اگلے لمحے نے اسے پسینہ سے شرابور کر دیا۔اور جیسے کسی نے پیروں سے وزنی پتھر باندھ دیئے ہوں۔ذہن میں عجیب سی ہلچل مچ رہی تھی۔اسے اندازہ نہیں ہو

پارہا تھا کہ وہ اسکول کی جانب جا رہی ہے یا واپس گھر کی طرف۔یا کسی ایسی منزل کی جانب جہاں اسے اپنے آپ کو کھونے کے بے شمار امکانات تھے۔اسے لگ رہا تھا جیسے تمام راستے دل کی طرف جا رہے ہیں۔خوابوں کی زمین ڈولنے لگی ہے۔ وہ خود ڈولنے لگی تھی۔زندگی میں پہلی بار دل نیند سے بیدار ہوا تھا۔اس دن کسی کام میں جی نہیں لگا ۔بڑی گڑبڑا کر رہ گئی تھی کلاس میں بچوں کو پڑھاتے ہوئے بار بار اسکی توجہ ہٹ جاتی تھی۔گھر آ کر پلنگ پر لیٹی ہی تھی کہ ببو دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔اس نے ببو کے گالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''ببو' ذرا تھک گئی ہوں۔تھوڑا سونا چاہتی ہوں۔تو جا کر باہر کھیل۔''

ببو ہنستا ہوا چلا گیا تو اس کے کانوں میں وہی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دی

ہیلو۔۔۔ہیلو۔۔۔ہیلو۔۔۔

گھبرا کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔دروازہ پر پڑا ہوا

پردہ ہوا کے جھونکے سے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اسے لگا جیسے دل کے دروازہ پر پڑی چلمن اٹھا کر کوئی اس کے وجود میں داخل ہو رہا ہے وہ مجحوب ہو کر فوراً اُٹھ بیٹھی ۔ادھر ادھر دیکھا اور چائے بنانے باورچی خانہ میں چلی گئی ۔ چائے بنانے لگی تو شکر ضرورت سے زیادہ ڈال دی۔ یہ کیا ہو گیا ہے اسے آج؟ اسے ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آ رہی تھی ۔شاید اس میں بھی کچھ تبدیلی ہو رہی تھی ۔اس اجنبی شخص نے جو کافی عمر کا لگتا تھا اس کے اندر ہلچل مچادی تھی۔ سر کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے۔ اس کی پوری شخصیت تروتازہ چہرہ میں مکمل ہو گئی تھی۔ چھریرا بدن ۔ بڑی اور پُر کشش آنکھیں۔ کشادہ پیشانی ۔اس کی شخصیت میں کچھ ایسی جاذبیت تھی جس کی وجہ سے جوان عورتوں اور نو خیز لڑکیوں کی نظریں اس کے چہرہ پر ایک لمحہ کے لیئے رکتی ضرور تھیں۔

اسی جاذبیت نے اس کے اندر سوئے ہوئے طوفان کو جگا دیا تھا۔ دل کو بہت سمجھایا مگر وہ ہے کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ آئینہ میں چہرہ کو دیکھ کر وہ پہلی بار شرمائی تھی ۔اور آئینہ بھی اب اس سے سرگوشیاں کرنے لگا تھا۔

☆☆

دروازہ سے باہر قدم رکھتے ہوئے وہ ہچکچانے لگی۔ اب وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ سامنے دور تک دیکھتے ہوئے ہاتھوں کی ہتھلیاں پسینہ سے بھیگ گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں چینوٹیاں رینگنے لگیں۔ آنکھوں میں تارے ٹوٹنے لگے۔ کانوں میں بے شمار آوازیں گڈ مڈ ہونے لگیں۔ اس نے تیزی سے راستہ بدل دیا۔ پھر کئی روز تک ادھر کا رخ نہیں کیا۔ نئے راستے سے گزرتے ہوئے بھی وہ خائف رہنے لگی۔ پتہ نہیں وہ ادھر بھی آ نکلے۔ معمول پر آتے آتے ایک مہینہ گزر گیا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ پھر پرانے راستے پر

آ گئی۔ پہلو میں دل کا شور بڑھنے لگا۔ آنکھیں دور تک اسے تلاشنے لگیں لیکن آج جسے آنکھیں اور دل ڈھونڈھ رہا تھا اس کے سامنے سے نہیں گزرا۔ اسکول پہنچتے پہنچتے اس کے اندر سورج ڈوب گیا۔ دل تڑپ کر رہ گیا۔

''آج کیوں نہیں آیا وہ؟''

''کہیں کچھ؟''

دل کی دھرتی سوگوار ہوگئی۔ جیسے بہار آتے آتے واپس لوٹ گئی ہو۔ اس کی آرزوئیں فرش پر گرے شیشہ کی طرح چکنا چور ہوگئیں۔ وہ مسلسل ایک ہفتہ تک نظر نہیں آیا۔ شاید اس کی بے اعتنائی نے اس کے دل کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ شاید وہ اس بے سکون زندگی میں داخل ہو کر اس کے اندھیرے گھر کو روشنی دینے آ رہا تھا۔ اگر وہ اس کے ہیلو کا جواب صرف ایک مسکراہٹ سے دیتی تو امنگوں سے لبریز دل چھلکنے نہ پاتا۔ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔۔۔دل کے کچوکوں نے اسے مضطرب کر دیا۔ خود اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

کیوں کہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ زندگی کا اکیلا پن اسے چین سے جینے نہیں دے گا۔ اس کے اپنے تو جیسے اسے بھول ہی گئے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے اسے۔۔۔ کیوں نہیں آ رہا ہے۔ کہاں چلا گیا ہوگا۔۔۔؟ کہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔۔؟ الجھی ہوئی سوچوں کے درمیان دھڑکنوں نے زبان کھولی۔۔ اسے کچھ ہو نہ ہو تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اب کیوں پچھتا رہی ہے؟ محبت کرنے والے سود و زیاں کے خانوں میں اپنے آپ کو تقسیم نہیں کرتے۔ وہ تو آتشِ عشق میں کود پڑتے ہیں۔ تو بھی کچّے گڑھے کے سہارے طوفان خیز موجوں میں کود جا۔

وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ سامنے وہی چہرہ نظر آیا۔ جس نے اس کی زندگی کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ چہرہ پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، آنکھوں میں چاہت کی روشنی۔ وہ ایک لمحہ کے لیئے گڑ بڑا گئی۔ اسے لگا جیسے کمر سے نیچے اس کے پیر ہی نہیں ہیں۔ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ اور وہ جیسے الٹے پاؤں پیچھے کی جانب چل رہی ہے۔

یہ دو چار قدم کا فاصلہ کتنی صدیوں میں طے ہوگا۔ کیسا سفر ہے یہ جو شروع بھی نہیں ہوتا اور ختم بھی نہیں۔ جیسے زندگی چاندنی کے سایہ میں کہیں تھم سی گئی ہے۔ اور جیسے چاند بھی دھرتی پر اتر آیا ہو۔ وہ قریب آیا تو اس کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ پھر شہنائی کی مدھر آواز کانوں کے پاس آ کر تھم سی گئی۔

"گڈ مارننگ۔"

"گڈ......"

"مارننگ...."

اس کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی دردبھری آواز سے اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں ۔ سارے بدن میں انجانے الاؤ دہک اٹھے۔ آنکھوں میں سرور گھل گیا۔ لیکن وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ اسکول پہنچتے پہنچتے نہ جانے کتنی صدیاں پھلانگ گئی۔ اسکول پہنچ کر وہ سیدھا اسٹاف روم میں گئی اور پنکھا آن کر دیا۔ چپراسی نے کمرہ میں داخل ہو کر پہلے پنکھے کو دیکھا پھر حیرت سے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھنے لگا۔ وہ کرسی کی پشت پر سر ٹیکے

آنکھیں بند کیئے بیٹھی تھی۔ چپراسی کے آنے کی اسے خبر نہیں تھی۔ سخت سردی میں تیزی سے گھومتا ہوا پنکھا چپراسی کے لیئے اچنبھے کا باعث تھا ۔اس نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

''بی بی جی؟''

''آں..'' وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور چپراسی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اتنی سردی پڑ رہی ہے۔اور آپ نے پنکھا آن کر دیا ہے؟

'' کیا بات ہے آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' چپراسی نے ہمدردی سے کہا۔

''ہاں...آں.....وہ....''اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''آپ کو صاحب بلاتے ہیں۔''چپراسی نے پنکھا بند کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔''اس نے دھیمے لہجہ میں کہا اور باہر نکل گئی۔

کمرہ میں داخل ہو کر اس نے ادب سے سلام کیا اور کھڑی ہوگئی۔

''آؤ! بیٹھو۔'' ہیڈ ماسٹر نے قلم رکھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی اور بے مطلب دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھنے لگی۔

'' آپ کچھ دنوں سے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہی ہیں۔آج بھی کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں کیا بات ہے؟'' ہیڈ ماسٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

'' اگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کچھ دن کے لیئے رخصت لے لیجیئے۔

''ہیڈ ماسٹر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''نہیں سر۔اب میں آپ کو شکایت کا موقع نہں دوں گی۔''

اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

'' پھر بھی اگر آپ کی کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے کہیئے۔شاید میں آپکی کچھ مدد کر سکوں۔'' ہیڈ ماسٹر نے انسانی ہمدردی سے کہا۔

''ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے سر۔۔اچھا اب میں چلوں؟''

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ہیڈ ماسٹر نے آہستہ سے کہا اور کاغذوں پر

جھک گیا۔

☆☆

تنہائی ایک عرصہ سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیئے بھاگ رہی تھی،لیکن اس کے لیئے فرار کے سب راستے بند ہو چکے تھے اور تنہائی ہے کہ اسے ڈسے جا رہی تھی۔وہ اپنے آپ کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کا ہمزاد ہر موڑ پر راستہ روک لیتا۔زندگی کے تقاضوں کی فصل اگ رہی تھی۔وہ راستہ بھولے ہوئے مسافر کی طرح بدن کے تہہ خانوں میں بھٹک رہی تھی۔اس کی منزل کی کوئی سمت نہیں تھی اور اب کسی ایک راستے کا انتخاب اس کے لیئے مشکل ہو رہا تھا۔جہاں زندگی کی صبح اور شام گلے مل رہے

تھے۔اب جب کہ بہاریں اس کے گھر آنگن سے لوٹ گئی تھیں۔کسی
نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔مستقبل کے
اندیشوں نے اسے کئی بار سوچنے پر مجبور کیا تھا۔لیکن بابا کے حصار سے
وہ باہر نکل نہیں سکی تھی۔حصار اب مہندم ہو چکا تھا۔اپنے ہی حصار میں
وہ مقید ہو کر رہ گئی تھی۔وہ ایک طرح سے خائف تھی کہ اور چاہتی بھی تھی
کہ کوئی اسے تھام لے۔اور جب تھامنے والا اس کے قریب آ رہا تھا تو
بیر بہوٹی کی طرح سمٹ رہی تھی۔یہ خدشہ بھی اس کے وجود سے لپٹا ہوا
تھا کہ کہیں وقت اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔اور وہ شکستہ فصیلوں
میں مقید ہو کر نہ رہ جائے۔شاید وہ وہاں کھڑا ہے جہاں وہ موجود نہیں
ہے۔کون ہے وہ؟ شاید وہی جو دل کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔
ہاں وہی تو ہے جو دھیرے دھیرے میری جانب قدم بڑھا رہا ہے۔
رُک رُک کر، سنبھل سنبھل کر، تھم تھم کرتا کہ شاخ پر بیٹھی ہوئی فاختہ
اڑ نہ جائے۔۔۔لیکن آج بھی وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔اس کی
جانب دیکھا بھی نہیں۔حالانکہ وہ اس کی زبان سے کچھ سننا چاہتی تھی۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ صرف ایک نظر اسے دیکھ کر چپ چاپ گزر جاتا۔ اس کی ایک نظر نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ تب ہی سے منجمد وجود کے اندر کی برف دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ اس کی پہلی نظر کا سامنا ہونے سے پہلے وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔ لیکن اب اسے اپنی موجودگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ پتہ نہیں وہ اب تک اپنے وجود سے باہر کیسے جی رہی تھی۔ وہ کونسی زندگی جی رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کہیں قریب ہی الاؤ سلگنے لگا ہے اور اس کی گرمی دھیرے دھیرے اندر اترنے لگی ہے۔ بے خواب احساسات تعبیر ڈھونڈنے لگے ہیں۔

اسکول جانے کے لیئے گھر سے نکل کر وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ وہ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر آنکھیں خمار آلود ہوگئیں۔ ہونٹوں میں چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جیسے جیسے وہ قریب آرہا تھا دل کچھ عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔
مسکراہٹ کا جواب اس نے شرمیلی مسکراہٹ سے دیا تو ہونٹوں کو دبائے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"I Love you "

"....I.."

"Love........."

" ....you "

لیکن اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اور اسے لگا جیسے بے شمار کبوتر اسکے اندر پھڑ پھڑانے لگے ہوں ۔ دو قدم آگے بڑھ کر پلٹ کر دیکھا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جیسے خوابیدہ مندر میں اچانک کئی گھنٹیاں ایک ساتھ گونج اٹھی ہوں۔ شرمیلی مسکراہٹ ہونٹوں سے اتر کر پورے وجود میں سرائیت کر گئی۔ دل کی پرتیں کھلتی گئیں۔آن کی آن میں ایک خوشگوار لمحہ اسے سرشار کر گیا۔ زندگی کا حسن خراماں خراماں پیار کی سوغات لیئے روشن لمحوں کی بشارت دے رہا تھا۔اماوس کی رات میں اچانک جیسے پورا چاند نکل آیا ہو۔۔۔ آئینہ میں اپنے سراپا کو دیکھا تو وہ بھی شرارت سے ہنس پڑا۔ آئینہ کی شرارت پر وہ شرما

کر رہ گئی۔ آئینہ بھی شریر ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس نے دل کی چوری پکڑ لی تھی۔ اب تک تو وہ اپنے آپ کو گلشن نا آفریدہ کی بلبل سمجھ رہی تھی۔ لیکن بدن کے روم روم سے پھوٹنے والی خوشبو سے اس کے خوابوں کا جزیرہ معطر ہو رہا تھا۔ بلاوے کی گرمی قریب ہی کہیں محسوس ہو رہی تھی۔ زمین نے رات کی چادر اوڑھی تو خوابوں کے دریچے وا ہونے لگے۔ درد کی لذت اس کے وجود میں قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔ آشاؤں کے دیپ کہیں اور جل رہے تھے اور روشنی اس کے خانہء دل میں ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے سارے چمن کی خوشبو اس کی سانسوں میں انڈیل دی ہو۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا اس سے سرگوشی کر رہے تھے۔ زندگی خوابوں کی سرزمین لگ رہی تھی۔ کل آج میں اور آج کل میں ڈھل رہا تھا۔ دل کے آکاش پر چاند پہلی بار مسکرایا تھا۔

اسے پہلی بار احساس ہوا کہ چاند بھی کتنا حسین ہوتا ہے۔ ہر روز صبح ہوتی تھی۔ رات چپکے سے پر سمیٹ لیتی تھی۔ لیکن آج کی صبح کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ آج کی صبح کا حسن شاید اس کی زندگی کا رخ موڑ دے شاید؟

اسکول جانے کے لیئے وہ تیار ہو رہی تھی کہ ببّو کہیں سے آ کر اس سے لپٹ گیا۔ اسے دیکھ کر شرارت سے مسکرانے لگا۔

''یہ کیا ببو تو نے بھی میری چوری پکڑ لی؟'' اس نے شرماتے ہوئے دل ہی دل میں کہا اور ببو کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ ببو نے جزبز ہو کر کسمساتے ہوئے کہا۔

''آنٹی، آج ہم پارک میں کھیلنے جا رہے ہیں۔''

''اچھا تو جلدی واپس آ جانا۔'' وہ ببو کی پیشانی چوم کر باہر نکل گئی۔

گھر سے باہر پہلا قدم رکھا تو زمین سے اپنائیت کا احساس جاگ اٹھا۔ وہ آہستہ آستہ قدم بڑھا رہی تھی۔ اور آنکھیں دور تک کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ۔۔۔ہاں شاید وہی ہے۔۔ہاں وہی تو ہے۔۔۔۔دونوں کی رفتار دھیمی ہو گئی۔

''....I..''

''Love........''

" ....you "

قریب آکر ایک لمحہ کے لیئے دونوں کے قدم رک گئے۔ مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ پھر جیسے تیز سنسناتی ہوئی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرا کر گزر گئی۔

''کل شام۔۔۔

پانچ بجے۔۔۔گاندھی پارک۔۔۔۔''

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اور اسے لگا جیسے پگھلا ہوا لمحہ اسے چھو کر گزر گیا ہے

''کل شام پانچ بجے گاندھی پارک'' اس کے تھرتھراتے ہونٹوں نے انجانے میں وہی جملہ دہرایا اور وہ اپنے آپ سے شرما کر رہ گئی۔ الجھی الجھی رفتار سے اسکول پہنچی تو وقت جیسے ایک نکتہ پر آکر ٹھہر گیا۔ تھمے ہوئے وقت کو وہیں چھوڑ کر گھر پہنچی اور روزمرہ کے کاموں میں الجھ گئی۔ لیکن ہر کام الٹا ہو رہا تھا۔ کھانا بناتے ہوئے

سالن میں مرچ کی بجائے شکر ڈالدی۔اور چائے مین شکر کی بجائے نمک ڈالدیا۔کوئی کام سیدھا نہیں ہو پا رہا تھا۔

''پگلی کہیں کی!'' سر پر چپت لگاتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆

شام کے چار بج رہے تھے۔گھڑی کی ٹک ٹک کانوں سے ہوتے ہوئے دل کے آس پاس گونجنے لگی۔دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔بدن میں خون کی گردش میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔آنکھوں میں انتظار کے لمحے سمٹ رہے تھے۔

''پریتم سے ملنے جانا ہے'' انجانے ہاتھ نے اسے گدگدادیا۔اور وہ چھوئی موئی ہو کر رہ گئی۔اس نے اپنے آپ کو ٹٹولتے ہوئے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

''اونھ !میں نہیں جاوں گی۔''

’’کیسے نہیں جائے گی؟ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھ۔ تجھے اب اپنے آپ پر اختیار ہی کب رہا ہے۔‘‘

یہ کون مجھے کچوکے دے رہا ہے؟ یہاں کوئی بھی تو نہیں۔ موجود تو صرف میں ہی ہوں۔ کیا میں ہی اپنے آپ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہوں۔ اپنے آپ کو بھی کوئی اسطرح ستاتا ہے؟ دل بھی کیا عجیب شے ہے۔ یہ جب کسی پر آتا ہے تو قیس قیس نہیں رہتا اور لیلیٰ لیلیٰ نہیں رہتی۔ وارداتِ دل انسان کو کہیں کا رہنے نہیں دیتی۔ شاہد مشہود بن جاتا ہے اور مشہود شاہد۔ کیا تیری بھی وہی منزل ہے؟۔۔۔ہاں۔۔۔۔شاید۔۔۔!

پارک کی سمت جانے کے لیئے اس نے پہلا قدم باہر رکھا تو دوسرا قدم اٹھا نہ سکی۔ جیسے زمین نے پیروں کو جکڑ لیا ہو۔ من ڈانوا ڈول ہونے لگا۔ دل نے جیسے دھڑکنے سے انکار کر دیا ہو۔ اسے اپنا ہی بوجھ ناقابلِ برداشت محسوس ہونے لگا۔ وہ گھبرائی ہرنی کی طرح سہم سہم کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ حلق اور زبان صحرا کی ریت ہو گئے تھے۔

"ہائے اللہ! مجھے آج یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہا۔ لیکن وہ جیسے انجان بن گیا۔ ساری خرابی اسی نے تو پیدا کی تھی۔ زندگی کے نئے رنگ نے اسے پہلی بار شرابور کر دیا تھا۔ ماتھے کا پسینہ پونچھ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کیسے آدھا راستہ طے کر چکی تھی۔ اسی رفتار سے چلتی ہوئی وہ پارک کے گیٹ کے پاس پہنچی۔ سانسوں کو درست کرتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پارک کے اندر وہ اسی کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آیا اور مسکراتے ہوئے آہستہ سے نرم لہجہ میں کہا۔

"تسلیم۔"

"تسلیم"۔ جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھر گئی۔

قدم بہ قدم چلتے ہوئے وہ پارک کے آخری اور سنسان حصہ میں پہنچ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بڑی دیر تک مسکراہٹوں کا تبادلہ خاموشی سے ہوتا رہا۔ ان کی بے زبانی جذبات کی زبان بن رہی تھی۔ دل کی وادیوں پر رم جھم رم جھم برکھا ہونے لگی۔ اور کہیں کوئل کوک رہی تھی۔ اس کا نرم و نازک ہاتھ مردانہ ہاتھ سے

چھواتو بدن سنسنانے لگا۔

''بیٹھئے نا۔''

''آں۔۔۔ہاں۔۔۔''اس نے نظریں جھکا دیں۔ وہ خیرہ کردینے والی نظروں کی تاب نہیں لا رہی تھی۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی۔۔۔وہ۔۔۔صنوبر،اور۔۔۔آپ کا۔۔؟''

''مجھے شمشاد کہتے ہیں۔''

''پھر خاموشی چھاگئی۔ وہ پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ شمشاد آم کا پتہ اٹھا کر چبانے لگا۔ دونوں چپ چاپ رک رک کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ رہ رہ کر چاندنی جیسی مسکرہٹ ہونٹوں پر بکھر رہی تھی۔ دلوں کی گہرائی سے چشمے ابل رہے تھے مسکراتی ہوئی آنکھیں سرگوشیاں کررہی تھیں دونوں ایک دوسرے میں ڈوب کر سرشار ہورہے تھے۔ اس نے ایک بار جی بھر کر شمشاد کو دیکھا اور مخمور لہجہ میں کہا۔

''آپ نے میری زندگی کے بند کواڑ کو کھول دیا ہے۔ اب اسے کھلا ہی رہنے دیجئے۔''

''ہاں صنوبر! میرے دل کا آئینہ اب تک گرد آلود تھا۔تم نے اسے شفاف بنا دیا ہے۔ میرے خواب کہر آلود تھے۔ دل پر اداسی کی گرد جمی ہوئی تھی۔اب زندگی کا ہر پل حسین ہو گیا ہے۔'' شمشاد نے خوابیدہ لہجہ میں کہا۔

صنوبر کو لگا جیسے وہ آزاد پنچھی کی طرح کائنات کی وسعتوں میں اڑ رہی ہے۔اور اس کے اطراف جگنو چمک رہے ہیں۔شمشاد نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سے قریب کرنا چاہا تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اور شرما کر نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔

''اب چلیں۔کافی وقت ہو گیا ہے۔''

''ہاں چلیں۔ہماری ملاقات پھر کب ہوگی صنوبر؟'' شمشاد نے جذباتی لہجہ میں کہا۔

''اگلے اتوار کو اسی وقت۔'' صنوبر نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اچھا خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

☆☆

اب تک صنوبر کی زندگی بے آب و گیاہ صحرا کی طرح تھی۔ یا پھر آوارہ بگولہ تھی جس کی کوئی سمت تھی اور نہ منزل۔ اس نے اپنی بے کیف زندگی کو کبھی کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ بس جیئے جارہی تھی۔ کیوں اور کس کے لیئے۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ بابا نے زندگی کا بڑا حصہ اس سے چھین لیا تھا۔ وہ تھے تو خوشیاں کم، دکھ اور آنسو زیادہ تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد زندگی کی ڈور کانٹوں سے الجھ گئی تھی۔ دل کی دھرتی پر سوکھا پڑ گیا تھا۔ شمشاد کے آنے سے پہلی بار اس کے لیئے چاندنی رات آئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی اس نے آئینہ میں

اپنا سراپا نہیں دیکھا تھا۔ اور اب وہ خود آئینہ بن گئی تھی۔ ہر چیز میں نیا پن دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ جدھر بھی دیکھتی رنگِ گلستان بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے آنے والی ہر صبح، صبح بنارس ہے تو ہر شام شام اودھ۔ پیار کی بہتی ندی میں ڈوب جانے کو جی چاہتا تھا۔ ببو کو موقع بے موقع چھیڑتی رہتی تھی۔ اسے چھیڑنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

☆☆

آج وہ تیسری بار مل رہے تھے۔ تیسری ملاقات میں وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے تھے۔ کافی دیر سے وہ ایک دوسرے کی دل کی کتاب پڑھ رہے تھے۔ آکاش کے جھروکے سے پونم کا چاند فضاء میں تیرتے ہوئے بادل کے ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ پارک کی خاموش فضاء چاندنی میں نہا رہی تھی۔ دور دور تک کوئی سایہ نظر نہیں آتا تھا۔ شمشاد نے ادھر ادھر دیکھا اور صنوبر کو بانہوں میں لے کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔ ایک اور قدم آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ صنوبر تڑپ کر اس کی بانہوں سے

نکل گئی۔ وہ اس کے لیئے بالکل تیار نہیں تھی۔ وہ سیدھا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چہرہ کا رنگ یک لخت بدل گیا۔ سانس پھولنے لگی۔ آنکھوں میں چراغ جھلملانے لگے۔ اس نے تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کیا ہے آپ نے ؟!"

"ہمارے پیار کی مہر تصدیق ثبت کرنا چاہتا ہوں !" شمشاد نے نشہ سے بوجھل لہجہ میں کہا۔

"شمشاد یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں" صنوبر نے ہونٹوں پر رومال پھیرتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ، دو جسموں کے ملاپ کا نام ہی محبت ہے، پیار ہے، عشق ہے، دیوانگی ہے"

شمشاد نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"نہیں ! شادی سے پہلے یہ سب گناہ ہے، جرم ہے۔"

صنوبر نے تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"شادی بھی ہو جائیگی میری جان !۔ یہ تم کس زمانہ کی خرافات لے بیٹھی ہو۔ شادی تو دکھاوے کا سماجی بندھن ہے۔ جسموں

کی اکائی ہی دراصل محبت کی معراج ہے۔'' شمشاد نے اپنے وجود سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کو خوفِ خدا نہیں ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ جنسی مریض ہیں۔ پاکیزگی کا دوسرا نام محبت ہے۔ اور شادی دینی فریضہ ہے۔'' صنوبر نے نرم گرم لہجہ میں کہا۔

شمشاد نے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ اپنی بانہوں میں لینا چاہا لیکن صنوبر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور حقارت سے اسے گھورنے لگی۔ شمشاد کے پیر پھسل رہے تھے۔ وہ دلدل میں اتر رہا تھا۔ صنوبر نے اسے روکتے ہوئے تیکھے لہجہ میں کہا۔

''شمشاد! اگر تم دست درازی کروگے تو میں چیخ پڑوں گی۔ دیکھو۔۔۔میں نے تم سے پیار کیا ہے۔ اگر تم کو مجھ سے واقعی محبت ہے تو فوری شادی کرلو۔ پھر جتنا چاہو مجھے سیراب کردو۔ میں تمھارے لیئے کھیتی بن جاوں گی۔ پھر مجھ میں جہاں سے داخل ہونا چاہو داخل ہوجاؤ۔ لیکن خدارا شادی سے پہلے مجھے آلودہ مت کرو۔''

"جانِ من! وصل کی لذت سے تم آشنا نہیں ہو۔ایک باراس لذت سے آشنا ہوجاؤ گی تو پھر ہر چیز کا ذائقہ تمہیں پھیکا لگے گا۔تم ابھی تک اپنے خود ساختہ خول میں بند ہو۔تم اپنے اندر والی عورت کا گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہو۔۔ مجھے آگے بڑھنے سے مت روکو۔آؤ آج ہم ایک ہوجائیں۔ہم دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں۔تم اپنے جذبات کا استحصال کر کے اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر سکو گی۔اس گھٹن سے نکل آؤ صنوبر۔ورنہ تم چین سے جی نہیں سکو گی۔"

شمشاد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شمشاد! تم سے محبت کر کے شاید میں نے بھیانک غلطی کی ہے۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس راستے پر میں نے قدم رکھا ہے۔وہ راستہ میرے خوابوں کی شکست کا المیہ ہے۔تمھاری ہوس نے تمھیں اندھا بنادیا ہے۔میرا آخری فیصلہ سن لو۔مجھے تم سے نفرت ہے۔

"I hate you !۔۔۔"اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی پارک سے باہر نکل گئی۔

☆☆

ایک کہانی جو ابھی شروع ہوئی تھی کہ المیہ سے دوچار ہوگئی۔صنوبر نے دوبارہ دل کے کواڑوں کو مقفل کرلیا شاید زندگی میں بہاروں کا منہ دیکھنا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔وہ گم صم کھڑی ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی۔اور آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے لگا جیسے اس کی آرزوؤں ،امنگوں ارمانوں اور چاہتوں کا سورج تو پہلے ہی غروب ہوچکا ہے۔اس کی زندگی کا سویرا ہوا ہی نہیں تھا۔شاید وہ صبح کاذب کو صبح صادق سمجھ بیٹھی تھی۔۔بے سمت پرواز میں پرندہ بھٹک ہی جاتا ہے۔مجبوری بھی کیا چیز ہے۔خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی

جان دے کر عشق کی لاج رکھ لیتے ہیں۔لفظوں کو بے لباس کرنے میں کتنے چالاک اور شاطر ہوتے ہیں شمشاد جیسے لوگ۔لفظ ہی تو محبت ہے۔کس نے سمجھا ہے اس کے مفہوم کو۔شاید میں ہی ایک ایسا لفظ ہوں جو اپنی معنویت کھو چکا ہے۔محبت۔۔۔ایک لفظ ہی تو ہے۔اور تخلیق کا محرک بھی۔۔۔چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔وہ سوچنے لگی کہ شاید اندھیرا کبھی دور نہیں ہوگا۔اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ پتہ نہیں اس نے کب صحیح وقت پر غلط فیصلہ کیا تھا یا غلط وقت پر صحیح۔لیکن صحیح یا غلط فیصلہ کرنے کا حق تجھے دیا کس نے تھا۔کیونکہ تیری زندگی تو کہیں رہن رکھ دی گئی تھی۔اور رہن رکھی گئی زندگی کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔دھوپ چھاؤں کا کھیل اسے راس نہیں آیا۔وہ بازی ہار گئی تھی۔لیکن یہ ہار نہیں اس کی جیت تھی۔کیوں کہ اسی نازک موڑ پر اسے اپنے وجود کے اجلے پن کے اسرار کا انکشاف ہوا تھا۔یہی عورت کی کمزوری ہے کہ جس وقت اسے سنبھلنا چاہیئے وہ پھسل جاتی ہے۔ اسے اس وقت ہوش آتا ہے جب وہ سب کچھ کھو چکی ہوتی ہے۔

اس نے سر کو جھٹکا اور گھر آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ سوچ کا سرا کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ بے ترتیب خیالات میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ کئی روز تک وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اندرونی کرب نے اسے مضمحل کر دیا تھا۔ کسی کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے وجود کو گیلے کپڑوں کی طرح نیچوڑ دیا تھا۔ اس کے اندر یہاں سے وہاں تک ویرانی ہی ویرانی پھیل گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھے اس نے اپنے خوابوں کو سمیٹ کر اپنے سینے میں محفوظ کر دیا۔ شمشاد کو اس نے دل کے افق پر طلوع ہونے والا تارہ سمجھا تھا۔ لیکن وہ شہابِ ثاقب کی طرح ٹوٹ کر تاریک فضاء میں گم ہو گیا۔ اور اس کی دنیا بھی تاریک کر گیا۔ پیار کا مفہوم اس کے لیئے کچھ اور تھا جسے شمشاد نے آلودہ کر دیا تھا۔ جس میں اس کی بربادی کا پورا سامان تھا۔ دنیا نے اسے کچھ دیا نہیں تھا۔ لیکن اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ دیارِ غیر میں بھٹک رہی ہے۔ جانے پہچانے چہرے اب اجنبی لگ رہے تھے۔ دل کے اندر

آتش دان سلگ رہا تھا۔لیکن وہ اوپر سے سمندر کی طرح خاموش اور پرسکون تھی۔ پرسکون وجود کی تہہ میں قیامت خیز طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ جانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جس نے اسے شمشاد کی جانب راغب ہونے پر مجبور کردیا تھا ہر چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔اس کے اپنے جذبات بھی جل کر خاکستر ہو گئے تھے جب کہ اسکی کٹی پھٹی زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔ نہ ہی اس نے کبھی زندگی میں خلاء محسوس کیا تھا۔ نہ ہی کبھی ہم سفر کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔کبھی ہوا بھی تھا تو اس نے اسے نظر انداز کردیا تھا۔ وہ خود ہی اپنی زندگی کی ہم سفر تھی۔اداس مسکراہٹوں کو اپنا اثاثہ بنالیا تھا۔ چاہت کے فریب نے اسے کہاں سے کہاں پہنچادیا تھا۔

☆☆

اسکول کو تین دن کی تعطیلات تھیں۔ان دنوں میں وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔غیر متوقع المیہ سے دوچار ہونے کے بعد اس کی سوچ کا رخ بدل رہا تھا۔زندگی گرد آلود ہوگئی تھی۔منزل تھی نہ منزل کا نشان کس نے کس سے بے وفائی کی۔بہت سوچنے پر بھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔کسی سے بات کرنے کو اس کا من نہیں کر رہا تھا۔لیکن ببو کو اس نے کچھ محسوس ہونے نہیں دیا۔اس کی دلجوئی کسی نہ کسی طرح کرتی رہی۔وہ اندر سے پوری طرح ٹوٹ چکی تھی۔زندگی کا اکیلا پن رہ رہ کر ڈس رہا تھا۔اس کو دکھ تھا کہ دل بھی بے وفا نکلا۔نہ جانے کیوں

زندگی کا سرا ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا تھا۔ وہ ایسی زندگی جی رہی تھی جس میں چراغ تو جل رہے تھے لیکن ان میں روشنی نہیں تھی۔ وہ سہارے کی تلاش میں نکلی تھی۔ لیکن دھوکہ کھا گئی۔ شمشاد کے کہے ہوئے الفاظ اس کی روح کی گہرائیوں میں سوئیاں سی چبھو رہے تھے۔

''ڈارلنگ! دو جسموں کے ملاپ کا نام ہی محبت ہے، پیار ہے، عشق ہے، دیوانہ پن ہے''

ہاں۔۔۔ دو جسموں کے ملاپ کا دوسرا نام محبت ہے۔ لیکن یہ تو جنسی استحصال ہے۔ اور جنسی استحصال کا نام محبت نہیں ہوسکتا۔ محبت تو شفاف آئینہ ہے۔ دو دلوں کا پاکیزہ ملاپ ہے۔ شمشاد! تم نے محبت کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں اگر سمجھتے تو مجھے رسوا نہ کرتے۔ مجھ پر کیچڑ نہ اچھالتے۔ ورنہ سیدھے راستہ سے آکر میرے دل کے ساتھ جسم کے بھی مالک ہوتے۔ اچھا ہوا تم نے اپنے من کی گندگی جلد ہی اگل دی۔ ورنہ اپنی مُلمّع چڑھی محبت میں پگھلا کر دیوانی بنا دیتے تو شاید میں پسپا ہو جاتی۔ تم نے اپنا لباس اتار کر اچھا ہی کیا کہ مجھے ڈوبنے سے

بچالیا۔ اس کے لیئے میں تمھاری ممنون رہوں گی اور۔۔۔۔ زندگی میں بھولے سے تمھارا خیال آیا تو نفرت سے تھوکونگی نہیں!۔۔۔جاؤ شمشاد میں نے تمھیں معاف کیا!۔

☆☆

اس نے ببو کو تیار کر کے اسکول روانہ کر دیا۔ اور باہر کا دروازہ جو ہمیشہ بند رہتا تھا یوں ہی کھلا چھوڑ دیا جیسے کوئی آنے والا ہو۔ اسکول جانے کی تیاری کرتے ہوئے وہ بار بار دروازہ کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ جبکہ خود اسے پتہ نہیں تھا کہ اس نے دروازہ کیوں اور کس کے لیئے کھلا رکھ چھوڑا ہے۔ اب کیفیت ایسی تھی کہ دل کے کواڑ پر کوئی سایہ بھی نہیں لہراتا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی ۔اسکول کا ٹائم ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر جیسے ہی اس نے دروازہ پر قفل ڈالا۔ اندر سے بھی کھٹ کی آواز سنائی دی، جیسے دل پر بھی کسی نے تالا ڈالدیا ہو۔

سڑک پر آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور چلتے چلتے ایک مقام پر رک گئی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پہلی بار ہونٹوں کی مسکراہٹ آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ یہیں دل کی داستان پہلی بار رقم ہوئی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہ سکی اور آگے بڑھ گئی۔ اسٹاف روم میں پہنچ کر ابھی دم بھی لینے نہ پائی تھی کہ چپراسی نے قریب آ کر کہا۔

''بی بی جی، صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔''

''اچھا'' اس نے چپراسی پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

ہیڈ ماسٹر نظریں جھکائے حاضری رجسٹر کو دیکھ رہے تھے۔

''آداب سر۔'' اس نے دبے دبے لہجہ میں کہا۔

''ارے صنوبر۔ آؤ بیٹھو۔'' ہیڈ ماسٹر نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔

'جی شکریہ۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آج تمھارا پیریڈ ایک گھنٹہ بعد ہے نا؟'' ہیڈ ماسٹر نے رجسٹر بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی سر۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

ہیڈ ماسٹر کچھ دیر تک خاموش بیٹھے ٹیبل پر پن گھماتے رہے۔ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور کچھ سونچتے ہوئے کہا۔

''صنوبر۔سونچتا ہوں جو بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ کہوں یا نہ کہوں''

''ایسی کیا بات ہے سر جس کے کہنے میں آپ اتنی احتیاط برت رہے ہیں۔'' صنوبر نے اپنائیت سے کہا۔

''کہیں تم ناراض تو نہیں ہو گی؟'' احتیاط ان کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی

''ہر گز نہیں سر۔آپ میرے باس ہی نہیں ۔میرے بزرگ بھی ہیں۔'' صنوبر نے مطمئین لہجہ میں کہا۔

ہیڈ ماسٹر کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر قلم ایک طرف رکھتے ہوئے دبی دبی آواز میں کہا ''صنوبر!تم میری بیٹی کے برابر ہو۔اس لیئے جب بھی تمھیں دیکھتا ہوں دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ تمھاری زندگی کا خالی پن مجھے ہمیشہ کترتا رہتا ہے۔ بیٹی!اکیلی اور تنہا لڑکی سماج

میں ہونے والی اونچ نیچ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔تم کو زندگی کا لمبا سفر طے کرنا ہے۔تمھارا مستقبل کہر آلود ہے۔میرا خیال ہے کہ تمھیں سہارے کی ضرورت ہے۔ایسے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے جو تمھیں تحفظ کی ضمانت دے سکیں۔اس لیئے....''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔میں سمجھی نہیں سر۔'' صنوبر نے الجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''ہاں ۔ بات صاف صاف ہی کہوں گا...صبوبر! تمھارے لیئے...ایک رشتہ آیا ہے۔لڑکا صحت منداور خوبصورت ہے، پلاسٹک کے کارخانہ کا تنہا مالک ہے۔صرف والدین اور کوئی نہیں ..میرا خیال ہے یہ رشتہ تمھارے لیئے نہایت موزوں ہے...''

ہیڈ ماسٹر بات ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ وہ کھڑی ہوگئی۔ انھوں نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور جھینپتے ہوئے کہا۔

''مجھے ڈر تھا کہ تم کو میری بات ناگوار گزرے گی۔اسی لیئے ہچکچا رہا تھا۔''

"نہیں سر۔۔۔ایسی بات نہیں۔۔۔آپ نہیں جانتے میں کیسے دوراہے پر کھڑی ہوں۔۔پھر بھی آپ مجھے سوچنے کے لیئے کچھ وقت دیجئے۔" صنوبر نے نظریں جھکا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی جب تمھارا جواب اثبات میں ہوگا۔" ہیڈ ماسٹر نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

" تو میں چلوں سر؟"

" اچھا۔"

گھر پہنچ کر اس نے ببو کو آواز دی اور پسینہ پونچھتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ ببو کو آتا ہوا دیکھ کر اکھڑے اکھڑے لہجہ میں کہا۔

" ذرا پانی لے آنا۔"

تھوڑی دیر میں ببو پانی کا گلاس لے آیا۔گلاس لے کر اسٹول پر رکھا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

" ببو تو ذرا میرے پاس بیٹھ۔آج کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

(۷۱)

’’ کیوں آنٹی طبعیت ٹھیک نہیں ہے کیا؟ ‘‘ بو نے معصومیت سے کہا۔

’’ نہیں رے۔بس ایسے ہی۔۔۔اچھا تو جا کر باہر کھیل۔ میں ذرا سونا چاہتی ہوں۔‘‘

پانی پی کر اس نے گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

لیکن نیند پلکوں سے نکل کر کمرہ کی دیوار پر لیٹ گئی وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگی۔

اس کے سوا کمرہ کی ہر چیز جیسے گہری نیند سو گئی تھی۔آج وہ نئے ہیجان سے دوچار ہو گئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی باتوں نے اسے بابا کی یاد دلا دی۔ کروٹ بدل کر دروازہ کی طرف دیکھا۔ وہاں ہلکی سی پرچھائیں کا احساس ہوا۔ جیسے بابا لمبے سفر سے واپس آ کر تھکے ماندے دروازہ میں بیٹھ گئے ہیں۔اتنے دنوں سے کہاں تھے بابا تم؟ بھول کر بھی مجھے یاد نہیں کیا۔۔آج اچانک کیسے یاد آ گئی میری؟

جاتے ہوئے میرے لیئے کچھ سوچا تھا تم نے؟ دیکھو حالات نے مجھے کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ تمھارے بغیر کیسے دن گزارے ہیں میں نے۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر جانا کیسے گوارا کیا تم نے۔ پر۔۔۔۔؟ تم بھی کیا کرتے۔ تمھاری مجبوری جو تھی۔ اور تمھاری مجبوری کیا تھی۔ یہ اچھی طرح جانتی تھی۔۔۔۔ سنو بابا۔۔۔ میرے لیئے ایک رشتہ آیا ہے۔ میری دلہن بننے کی حسرت تو تم اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ ایک خدا ترس نے میرے لیئے آپ کی جگہ سنبھال لی ہے۔ کہو بابا تم خوش ہونا۔ تمھاری کرب میں لپٹی ہوئی روح کو سکون مل رہا ہے نہ ؟۔۔۔۔ دیکھو تمھارے چہرہ پر مسکراہٹ کتنی بھلی لگ رہی ہے۔۔۔ ہنسو نا بابا۔ خوب ہنسو۔۔۔ کھلکھلا کر۔۔۔ میں نے کبھی تمہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔ تمہارے ساتھ مجھے بھی تھوڑا ہنسنے کا موقع دو۔ تمہارے ساتھ میں بھی اپنی ہنسی بھول گئی تھی۔۔ آں۔۔ ہاں۔۔ آں۔۔۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ جیسے کسی نے نیند سے جگا دیا ہو۔ اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ دروازہ کا پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ شاید وہ اپنے لا

شعور میں اتر گئی تھی۔ بستر سے اٹھ کر وہ باورچی خانہ میں گئی اور چائے
بنا کر چائے پینے لگی۔ چائے پیتے ہوئے ببو کا چہرہ آنکھوں میں جھانکنے
لگا۔۔ وہ سوچنے لگی ببو بھی بے سہارا ہے۔ اس کا کیا ہوگا۔ کون اپنائے
گا اسے۔ باپ پاکستان جا کر اسے بھول ہی گیا ہے۔ جھوٹ موٹ
بھی کبھی یاد نہیں کرتا۔ جیسے ببو سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ببو بھی کتنا
بدنصیب ہے۔ بالکل میری طرح۔ میرے سوا اس کا کون ہے۔ کہاں
جائے گا وہ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ہاں! بڑا ہو کر وہ ضرور میرا
سہارا بنے گا۔ لیکن اتنے لمبے عرصہ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کل کا کس کو
پتہ ہے۔۔ یہ رشتہ مجھے قبول کر لینا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ ببو کو بھی قبول
کر لیں۔ ہم دونوں کو ہی سہارے کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا وہ اسے
قبول کریں گے؟ ہاں!۔۔ میرا دل کہتا ہے وہ ببو کو قبول کرنے سے
انکار نہیں کریں گے۔ اگر۔۔۔۔؟ اس کے خیالات کا سلسلہ درمیان
ہی میں ٹوٹ گیا۔ ببو اسے جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آنٹی۔ آنٹی، مجھے بھوک لگی ہے۔"

اس نے چونک کر پیالی نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ببو۔تو بیٹھ کر سبق یاد کر۔ میں ابھی کھانا تیار کرتی ہوں۔“

ادھوری چائے چھوڑ کر وہ کھانا تیار کرنے میں لگ گئی۔ کھانا تیار کرتے ہوئے اسکی سوچ ببو میں اٹکی ہوئی تھی۔ ببو اس کی روح کا غلاف بن گیا تھا۔ زندگی کا ایک ہی محور و مرکز تھا اور وہ تھا ببو! وہ کسی صورت میں بھی اس سے الگ نہیں رہ سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ اس کی مرحوم بہن کی آخری نشانی تھا۔ اور اسی کے وجود سے اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ اسی کی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔۔۔ ببو ابھی دسویں سال میں قدم رکھ رہا تھا۔ لیکن پندرہ سال کا لگتا تھا۔ اس کی اٹھان دیکھ دیکھ کر اس کی زندگی کا ایک ایک پل انبساط سے لبریز ہو جاتا تھا۔ اور بھٹکی ہوئی ممتا نہال ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس خوف سے خائف ہو جاتی تھی کہ ببو کو کہیں اسی کی نظر نہ لگ جائے۔

☆☆

ایک ہفتہ بعد پوری طرح مطمئین ہو کر وہ ہیڈ ماسٹر کے کمرہ میں داخل ہوئی۔

''کیا میں اندر آسکتی ہوں سر؟''

''آؤ بیٹی آؤ، اندر آنے کے لیئے تمھیں اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہیڈ ماسٹر نے مسکراتے ہوئے خوشگوار لہجہ میں کہا۔

ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بات کرنے کے لیئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگی۔ ہیڈ ماسٹر نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''کہو صنوبر، کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''سر۔۔۔بات یہ۔۔۔ہے کہ۔۔۔'' وہ بات کو آگے بڑھانے کے لیئے لڑکھڑانے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہیڈ ماسٹر نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''آپ جانتے ہیں کہ ببو میرے لیئے ایک مقدس اثاثہ ہے۔ اور میری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ سر میں اسے اپنے سے الگ نہیں کر سکتی۔'' صنوبر نے سنبھل کر کہا۔

''ہاں جانتا ہوں۔ ببو کا مسلہ اہم ضرور ہے۔ اس کے لیئے کیا کیا جا سکتا ہے؟'' ہیڈ ماسٹر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ لوگ ببو کو اپنانے تیار ہیں تو۔۔۔'' صنوبر نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

ہیڈ ماسٹر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر اعتماد سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ان کے گھر میں کوئی بڑا آدمی یا بچہ نہیں ہے۔ ببو سے ان کے گھر میں رونق

آجائے گی۔ بڑا پرکشش بچّہ ہے۔ دیکھتے ہی نچھاور ہونے کو جی چاہتا ہے۔ میں ان سے بات کرلوں گا۔ ٹھیک۔۔۔؟''

''جی۔۔۔؟''صنوبر نے نظریں جُھکا دیں۔

'' بیٹی! تم مجھے اپنے بابا کی جگہ سمجھنا۔ تمھاری شادی کے پورے انتظامات میرے ذمے رہیں گے۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرنا۔'' ہیڈ ماسٹر کا لہجہ جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔

صنوبر نے نظریں اٹھا کر ہیڈ ماسٹر کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ نظریں اٹھا نہ سکی۔ کیوں کہ آنسو کناروں میں جھلملانے لگے تھے۔ وہ اُٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

ببو نے سنا تو گم صم ہو گیا۔ اس دن اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس کے رویہ کو دیکھ کر صنوبر کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے بے تحاشہ بابا کی یاد آگئی۔ انھوں نے بھی اسے اپنی زندگی جینے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے لگا جیسے بابا چارپائی پر لیٹے آسمان کو تکے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کیا بھی کیا تھا۔ آج ببو اس کا راستہ روک کر کھڑا

ہوگیا ہے۔ وہ آہستہ سے ببو کے قریب گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔اس نے پیار بھری نظروں سے ببو کے بھولے چہرہ کو دیکھا۔اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ببو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔کہا کچھ نہیں۔

صنوبر نے محتاط لہجہ میں کہا۔

'تو اکثر کہتا تھا نا کہ تجھے پپا نہیں ہیں۔''

وہ پھر بھی خاموش رہا۔صنوبر نے اس کے چہرہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ببو! اس دنیا میں ہمارا کون ہے۔ ہمارے دکھ سکھ کو سمجھنے والا کوئی بھی تو نہیں ۔کب تک ہم سہم سہم کر جینے کا جتن کرتے رہیں گے۔ شاید خدا کو ہماری بے بسی پر رحم آ گیا ہے۔ہمیں سہارے کی ضرورت ہے بیٹے۔ تجھے تیرے پپا مل جائیں گے۔پھر تجھے اسکول میں بچے چھیڑیں گے نہیں۔کیا تجھے پپا کا پیار نہیں چاہیئے۔؟''

صنوبر بات ختم کر کے ایک ٹک اس کے چہرہ کو دیکھنے لگی۔ ببو نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں اور بے تحاشہ اس سے لپٹ گیا۔

☆☆

ہیڈ ماسٹر نے صنوبر کی شادی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ ہر کام اپنی نگرانی میں انجام دے رہے تھے بڑے اہتمام اور سلیقہ سے تمام امور طے کر رہے تھے۔ ان کی ہمدردی اور خلوص کو دیکھ کر آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ ببو سے لپٹ کر خوب روئی۔ ببو بھی رو پڑا۔ اپنے آنسوؤں کو بھول کر صنوبر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''مت روا آنٹی۔ میں تمھارے پاس ہوں نا!''

لیکن ببو کو کیا معلوم تھا کہ اس کو کونسا دکھ ہے۔ کس کرب میں مبتلا ہے۔ بابا کی یاد کر کے اس کا دل کتنی بار رویا ہے۔ اس نے ببو سے کچھ نہیں کہا۔ اس کا دل رکھنے کے لیئے اوپر سے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

(۸۰)

شادی بڑی خوش اسلوبی سے اختتام کو پہنچی۔ بدائی کے وقت صنوبر ہیڈ ماسٹر سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ ہیڈ ماسٹر اسے سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رو پڑے۔ ببو بھی ان دونوں سے لپٹ گیا شادی کے مہمان دم بخود ہو گئے خوشی کے ماحول میں اداسی کا رنگ گھل گیا ہیڈ ماسٹر اس کے سر پر آخری بار شفقت کا ہاتھ رکھ کر جدا ہو گئے۔ وہ پھولوں سے سجی کار میں بیٹھ گئی۔ کار دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ جاتی ہوئی کار کو دیکھ کر ہیڈ ماسٹر کو لگا جیسے ان کی سگی بیٹی گھر آنگن اور دل ویران کر کے جارہی ہے۔ کار کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہ بت بنے کھڑے رہے۔

دولہا کا خوبصورت بنگلہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کار صدر دروازہ پر رکی تو کئی شوخ وشنگ لڑکیوں اور عورتوں نے کار کو گھیر لیا۔ کار سے اسے اتار کر سجے سجائے کمرہ میں لے جا کر صوفہ پر بٹھایا گیا۔ وہ ابھی سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کے ساتھ سریلی آواز ابھری۔

وہ آئے گھر ہمارے یہ خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

''دلہن بھابی ذرا سنبھل کر بیٹھنا وہاں ہمارے بھیا کا دل رکھا ہے۔کہیں ٹوٹ نہ جائے۔''

وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔ ایک ساتھ کئی قہقہے اسے گدگدا گئے۔کسی نے گھونگھٹ الٹا تو اس نے گردن جھکا دی۔

''ارے بھئی گردن ان کے سامنے جھکانا۔''

ایک ساتھ شرارت آمیز ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ صنوبر اور گٹھڑی بن گئی۔ایک شریر لڑکی نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''ہائے ڈارلنگ۔۔۔دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجئے۔''

جواب میں دوسرا فقرہ فضاء میں اچھلا۔

''نہیں بھئی ہم تو دل ہی لیں گے۔جان لے کر کیا کریں گے؟''

''اری بنو، دولہا بھائی سے بھی پوچھ لے کہ وہ کیا لیں گے۔

جان یا دل؟''

وہ خود بھی ان بے ساختہ جملوں اور نکیلے فقروں اور کھنکھناتی ہنسی کے فوّاروں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ رات دیر گئے تک ہنسی مذاق، فقرے بازی لطیفوں کے انار چھوٹتے رہے۔ خوشگوار ماحول پر ہلکی سی تھکن کے آثار نظر آنے لگے تو ایک نوخیز لڑکی نے اس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلیئے بھابی۔ آپ کے کمرہ میں چلتے ہیں۔ یہ تو یہیں صبح کر دیں گی۔''

وہ اٹھ کر لڑکی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے حجلہ عروسی میں پہنچی۔ کمرہ عطر اور پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کمرہ کو بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا۔ مسہری پھولوں کی جالی سے خوابوں کی سیج لگ رہی تھی۔ وہ نوخیز لڑکی اسے مسہری پر بٹھا کر شرارت سے ہنستی ہوئی چلی گئی۔ اس نے کنکھیوں سے سجی ہوئی مسہری کا جائزہ لیا۔ اس پر پھولوں کی اتنی دبیز چادر چاروں طرف سے ڈالی گئی تھی کہ باہر کا کچھ نظر نہیں

آتا تھا۔ پھولوں کی رات میں وہ نرم و گرم مسہری پر بیٹھی دل کی دھڑکنوں کو گن رہی تھی۔ آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ آج سہاگ رات اس کی قسمت کا دروازہ کھول کر آئی تھی۔ جسے وہ تقریباً بھول ہی چکی تھی اس نے سونچا بھی نہیں تھا کہ وہ زندگی میں کبھی دلہن بھی بنے گی۔ نہ جانے قسمت کیسے مہربان ہوگئی۔ اور آج وہ دلہن بنی دلہا کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس گھڑی کے انتظار میں اس کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ عروسی کمرہ میں آئے اسے کافی وقت ہو چکا تھا۔ لیکن پیا ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ انھیں دیکھنے کے لیئے تڑپ رہی تھی۔ اسنے سنا تھا کہ وہ بڑے صحت مند، اونچے پورے اور خوبصورت ہیں۔ پھولوں کی جالی اٹھا کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا اور اس پر پڑا ریشمی پردہ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا۔ اسے لگا جیسے ہلتے ہوئے پردہ میں اس کا دل اٹک گیا ہے۔ اور وہ مسہری پر بیٹھی گزرتے ہوئے وقت کے دامن کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی

وقت ہے کہ آگے ہی رینگتا جا رہا تھا۔ دروازہ میں آہٹ ہوئی۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔

''ہائے اللہ۔۔۔ شاید وہ آ گئے۔۔۔ اب میں کیسے ان کا سامنا کر سکوں۔۔۔ گی؟'' اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ تپتے ہوئے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ آنکھوں میں سرخی تیرنے لگی۔ سینے میں غبار سا محسوس ہونے لگا۔ جیسے جیسے قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ من اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ پھولوں کی چادر اٹھا کر مسہری پر بیٹھ گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ لیکن وہ تو خاموش بیٹھے ہیں۔ کچھ بولتے ہی نہیں۔۔ قریب آیئے نا۔ دور کیوں بیٹھے ہیں؟۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ وہ قریب آ کر گھونگھٹ الٹیں گے۔ اور پھر؟ لیکن نہ ہی وہ قریب آئے اور نہ ہی گھونگھٹ الٹا۔ بڑی دیر بعد انھوں نے آہستہ سے آواز دی۔

''صنوبر۔''

کس نے پکارا؟۔۔ ہائے اللہ اور کون ہو سکتا ہے۔ کتنی

مٹھاس ہے اس آواز میں۔اور کہیئے نا۔۔۔صنوبر۔۔۔

''جی؟'' اس نے بہت آہستہ سے دبے دبے لہجہ میں کہا۔

''کچھ کہا تم نے صنوبر؟''

تو کیا انھوں نے مجھے آواز نہیں دی؟۔۔۔اس نے بغیر حرکت کے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔اسے لگا جیسے کوئی چیز فرش پر گر کر ٹوٹ گئی ہے۔کمرہ میں بالکل خاموشی تھی۔جیسے صحرا کی رات کمرہ میں در آئی ہو۔وہ گم صم بیٹھی اپنے وجود کو کریدنے لگی۔کوشش کے باوجود آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں۔

''آں؟'' اس نے گھبرا کر گھونگھٹ الٹ دیا۔

''کیا سو گئی تھیں؟'' میاں نے اس کے چہرہ پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی؟۔۔۔جی نہیں۔۔۔اس نے آہستہ سے کہا اور گھونگھٹ کھینچ لیا۔۔یہ کیا انھوں نے مجھے غور سے دیکھا بھی نہیں! نہ ہی یہ کہا کہ سرخ عروسی جوڑے میں میں کیسی لگ رہی ہوں۔میں نے

پلک جھپکتے انھیں سرتاپا دیکھ لیا ہے۔ ہائے اللہ کیا مردانہ حسن ہے۔ کیا سراپا ہے۔ حسین چہرہ میں کیسی کشش اور جاذبیت ہے۔ جوانی تو جیسے پھوٹی پڑتی ہے۔ میرے پروردگار میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ جی چاہتا ہے قربان ہو جاوں۔ لیکن وہ خاموش کیوں ہیں۔ کیا اتنا ہی پوچھنا تھا۔ سہاگ کے جوڑے میں عورت کا حسن کتنا نکھر جاتا ہے۔ آگے صرف دو بول ہی کہہ دیتے کہ صنوبر تم اس عروسی لباس میں کتنی حسین لگ رہی ہو۔ اس نے پہلو بدلا۔ دل میں جلتی ہوئی قندیل کی لو مدھم پڑنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ ان کو پھر چپ کیوں لگ گئی ہے۔ جی بھر کر میرے چہرہ کو دیکھتے مجھے اپنی باہوں کی زینت بناتے۔ لیکن وہ جماہی لے کر لیٹ گئے اور صنوبر سے غیر جذباتی اور سرد لہجہ میں کہا۔

''سو جاؤ صنوبر، شاید تمھیں بھی نیند آرہی ہوگی۔''

وہ چپ رہی۔ کیسے آدمی ہیں یہ۔ آج کی رات سونے کے لیئے کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ زندگی میں ایک ہی بار یہ رات آتی ہے۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ جیسے بدن کے اندر جلتے ہوئے

ارمانوں کے دیپ ایک دم بجھ گئے ہوں۔اس نے سر سے پاوں تک اپنا جائزہ لیا۔قیمتی سُرخ جوڑے میں وہ اپنے آپ کو قیدی محسوس کرنے لگی۔اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے میاں کو دیکھا۔وہ پاوں پسارے بےفکری سے سو گئے تھے۔اوران کے خراٹوں کی آواز اس کے وجود پر پتھر برسا رہی تھی۔اڈے ہوئے جذبات پر برف گرنے لگی۔اسے لگا جیسے جسم کا چپہ چپہ لہولہان ہو گیا ہو۔گھونگھٹ اٹھا کر اس نے آبدیدہ آنکھوں سے میاں کے سراپا کو دیکھا۔گورا کھلتا ہوا رنگ۔صحت مند جسم۔قد چھ فٹ کے قریب۔جوانی جیسے پر شور آبشار۔چہرہ پر مردانہ حسن انگڑائیاں لے رہا تھا۔لیکن آج وہ کہاں ہیں؟ ٹوٹے ہوئے دل میں ٹمٹماتا ہوا امنگوں کا دیا خاموش ہو گیا۔اوراس کے وجود کے اندر ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔اسے لگا جیسے چاروں اور پھیلا ہوا اندھیرا اس کے اطراف حلقہ تنگ کرتا جا رہا ہے۔اور اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔میاں تو سو گئے تھے اور وہ جاگ رہی تھی۔

آنکھوں میں کانٹوں کی چبھن لیئے۔ جیسے اس کے اندر پھیلے ہوئے صحرا
میں ببول اُگ آئے ہوں۔ اور جیسے کسی نے جنگل کے اطراف لگی
باڑھ میں آگ لگا دی ہو، اور باہر نکلنے کے تمام راستے بند ہو گئے
ہوں۔ اس کی بے صدا چیخیں جنگل میں بھٹک رہی ہوں پتہ نہیں کہ وہ
رو رہی تھی یا جنگل رو رہا تھا۔ شاید وہی رو رہی تھی۔ کیونکہ اس کے
آنسوؤں سے سہاگ کا جوڑا بھیگ گیا تھا۔ اس نے جالی اٹھا کر کھڑکی
سے باہر تاریک آسمان کی وسعتوں میں دیکھا۔ ایک تارہ ٹوٹ کر
تاریکی میں کہیں گم ہو گیا۔ اسے لگا جیسے وہ ٹوٹا ہوا تارا وہ خود ہے جو
ٹوٹ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ میاں نے گہری نیند میں کروٹ بدلی تو وہ
سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اور سوچنے لگی کہ ان کو نیند سے جگا دے۔ پھر یہ
سوچ کر خاموش ہو رہی کہ اگر وہ جاگنے والے ہوتے تو سوتے ہی
کیوں؟ کیا یہ رات زندگی میں پھر کبھی آئے گی۔ راتیں تو آتی اور
جاتی رہینگی۔ لیکن یہ ارمانوں بھری پھولوں کی رات پھر کبھی نہیں آئے
گی رات اپنا سفر ختم کر کے بساط لپیٹ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی گردوں

پر پھیل رہی تھی ۔ فجر کی اذان کے ساتھ میاں جماہی لیتے ہوئے اُٹھ بیٹھے اور اسے مسہری کے ایک کونے میں بیٹھی دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

''ارے آپ سوئی نہیں؟ ''

وہ کیا جواب دیتی کہ تمام رات جاگتی آنکھوں میں سپنے سجاتی رہی ہے۔ میاں نے اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔ لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھا اور کمرہ سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے دروازہ بھیڑ لیا تو وہ ذرا ستانے کے لیئے لیٹ گئی۔ نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگی تھیں کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پازیب کی آواز قریب آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ پازیب کی آواز قریب آکر رک گئی۔ پھر دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''چلیئے دلہن بھابی حمام میں چلتے ہیں۔''

حمام سے واپس آکر وہ مسہری پر لیٹ گئی۔ ملازمہ نے دودھ کا گلاس لے کر کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''بی بی دودھ۔''

''رکھ دو۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔''

وہ دودھ کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر جانے لگی۔

''سنو۔'' اس نے ملازمہ کو روکتے ہوئے کہا۔

''جی بی بی جی۔'' ملازمہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''حلیمہ۔''

''حلیمہ۔ ببو کہاں ہے؟''

''وہ بڑے صاحب کے کمرہ میں ہیں۔'' حلیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسے یہاں بھیج دو۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی اچھا۔''

حلیمہ کے جانے کے بعد وہ تولیہ سے گیلے بال پونچھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ببو دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ ببو کو دیکھ کر مغلوب ہو گئی۔ اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔

''کیسا ہے تو۔ کہاں سویا تھا؟'' نئے گھر میں کچھ پریشانی تو نہیں ہوئی۔''

''نہیں آنٹی۔ وہ بڑے بابا ہیں نا۔۔ کیا کہنا چاہیئے انھیں؟ ببو نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''دادا جان۔''صنوبر نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں دادا جان۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ میں اُن کے کمرہ میں ہی سویا تھا۔

رات انھوں نے ایک اچھی کہانی سنائی۔ خوب باتیں کیں۔ صبح ہوئی تو دودھ، سیب، انگور، اور نہ جانے کیا کیا کھلا دیا''

''اچھا! پھر تو بڑے مزے ہیں تمھارے۔'' صنوبر نے اسے گدگداتے ہوئے کہا۔

''اچھا ببو وہ۔۔۔ کہاں ہیں؟''

''وہ کون؟'' ببو انجان بن کر شرارت سے مسکرانے لگا۔

''شریر کہیں کا!''صنوبر نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے

ہوئے کہا۔

''وہ تو ناشتہ کر کے کہیں باہر گئے ہیں۔''

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اور اسے لگا جیسے پھر ایک تار ٹوٹ کر تاریکی میں کہیں گم ہو گیا۔ ببو نے اس کے چہرہ پر پھیلتی ہوئی اداسی کو دیکھ کر صنوبر کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنے گال اس کے گالوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔

'' آنٹی، تم اداس کیوں ہو گئیں؟''

'' نہیں ببو! میں کہاں اداس ہوں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔'' اس نے اُوپر سے مسکراتے ہوئے کہا اور دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

'' لے پی۔''

''نہیں آنٹی۔ تم پیو نا۔'' ببو نے اسکا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

''تو پی لے'' صنوبر نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

بو نے دودھ پی کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور کمرہ کی سجاوٹ کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ صنوبر اس کے قریب کھسک آئی اور آہستہ سے پوچھا۔

'' اس گھر میں اور کون کون ہیں؟''

'' حلیمہ ہے۔ اور دو چار نوکر ہیں۔ اور باقی سب مہمان لگتے ہیں۔''

'' اچھا بو تم اسکول جاؤ۔ میں ذرا لیٹتی ہوں۔'' صنوبر نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''بائے بائے آنٹی۔'' بو نے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرہ سے باہر چلا گیا۔

☆☆

۱۸) رات نے پر پھیلانے شروع کئے۔ پیا سے ملنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس نے خوب میک اپ کیا۔ اٹھنے سے پہلے آئینہ میں اپنے سراپا کو دیکھا۔ اور کھل اٹھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان سے اتری کوئی اپسرا ہے۔ پھر مسہری پر بیٹھ کر میاں کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میاں کمرہ میں داخل ہو کر نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ایک ٹک اسے دیکھنے لگے۔ پھر خوش ہو کر کہنے لگے۔

'' صنوبر۔ آج تمہارے بناؤ سنگھار کو دیکھتے ہوئے ایسا لگ

رہا ہے جیسے آج واقعی شبِ عروسی ہے۔'' اس نے شرما کر چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔ انھوں نے تھوڑے توقف سے پھر کہا۔

'' کچھ بولوگی نہیں؟ ''

'' بیٹھیئے نا۔ آپ کھڑے کیوں ہیں۔'' صنوبر نے شبنمی لہجہ میں کہا۔ وہ اس کے قریب لیٹ گئے۔ اور ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔ ان کے اِس طرح دیکھنے سے وہ مارے شرم کے پانی پانی ہوگئی۔ اور مجوب لہجہ میں کہا۔

'' آپ اِس طرح کیا دیکھ رہے ہیں؟ ''

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دھیرے سے آنکھیں بند کرلیں۔ صنوبر نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا اور شرٹ کے بٹن کھول کر سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر کھسک کر اور قریب آگئی۔ لیکن وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹے رہے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور ان کے ماتھے پر آئے پسینہ کو پونچھتے ہوئے کہا۔

'' سو گئے کیا؟ ''

"نہیں تو۔کیا تمھیں نیند آ رہی ہے۔" انھوں نے بے نیازی سے کہا۔

مجھے نیند کیسے آئے گی۔میری نیند تو تم نے چرالی ہے۔ میرے خواب آنکھوں ہی میں منجمد ہو گئے ہیں۔وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ یہ کیسا نوجوان ہے کہ آگ سے قریب رہ کر بھی سردی سے کپکپا رہا ہے۔جیسے اس کے وجود میں برف جم گئی ہو دل میں گرہ پڑ گئی۔اس نے اٹھ کر میاں کے چہرہ کو دیکھا جو ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔وہاں نہ کوئی رنگ تھا نہ کسی احساس کا پرتو۔آنکھیں برسوں سے سوکھی جھیل لگ رہی تھیں۔اس نے ان کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے وارفتگی سے کہا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟"

"نہیں تو صنوبر۔" انھوں نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

"پھر آپ۔۔۔" اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی اور دوسری جانب منہ پھیر لیا۔

"صنوبر۔" ان کے لہجہ میں اندر کا کرب جھانک رہا تھا۔

"جی۔" اشتیاق کی لو تیز ہونے لگی۔

" تھوڑے توقف کے بعد میاں نے بجھے بجھے لہجہ میں کہا۔

"ایک بات تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ کیا سن سکو گی۔"

"ایسی کیا بات ہے۔ کہہ دیجیئے نا۔ آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔ میں ہر بات سننے اور سن کر برداشت کرنے کی عادی ہو چکی ہوں۔" صنوبر نے سینہ میں اٹھتے ہوئے ہیجان کو دباتے ہوئے کہا۔

"وہ بات ہی کچھ ایسی ہے صنوبر۔ اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ مجھے جینے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اگر زندہ رہوں تو کیوں اور کس لیئے ۔کیوں کہ میری زندگی خود میری اپنی نہیں ہے۔ یہ زندگی جس نے دی اسے لوٹانا چاہتا ہوں اور پپا ہیں۔ مجھے جینے کیلئے مجبور کر رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنی زندگی جینے کے لئے مجبور کر رہے ہیں اس بنگلے میں ہم دونوں کے علاوہ دو چار ملازم ہیں۔ پپا کے بے حد اصرار یا یوں کہو کہ مسلسل دباؤ کی وجہ سے میں نے تم سے شادی کی۔ شاید ہم دونوں ناانصافی کا شکار ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔" آگے ان کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ تھوک نگل کر خاموش ہو گئے۔

صنوبر نے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"آگے کہیئے نا خاموش کیوں ہو گئے۔ میں نے کہا نا کہ میں ہر چیز کو برداشت کرنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالیئے۔"

"صنوبر۔۔۔وہ۔۔" ان کی زبان جیسے تالو سے جا لگی۔

"ہاں کہیئے نا۔" صنوبر نے تڑپ کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ۔۔۔میں تم کو وہ۔۔۔خوشی۔۔نہیں دے سکتا جو۔۔۔ایک مرد عورت۔۔۔کو۔۔دیتا ہے۔۔۔"

کہتے کہتے وہ ایک دم خاموش ہو گئے اور گھٹنوں میں سر دے کر سسکنے لگے۔ صنوبر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیسے فالج مار گیا ہو۔ اور زندگی ایک نکتہ پر پہنچ کر پتھر ہو گئی ہو۔ جیسے سنسناتی ہوئی گولی دل کو چھید گئی ہو۔ وہ پلک جھپکائے بغیر یک ٹک میاں کو دیکھتی رہی۔ زمین کی گردش جیسے ایکدم تھم گئی ہو۔ میاں باہر سے سسک رہے تھے اور وہ اندر سے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اندرونی کرب کو پہلو میں دباتے ہوئے کہا۔

''بہر حال آپ نے ۔۔جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ میں اپنی زندگی میں جیسی بھی تھی خوش تھی آپ نے مجھے سوکھی ندی میں غرق کردیا۔۔آپ شادی سے انکار کرسکتے تھے۔اوراپنی کمزوری پپا سے کہہ سکتے تھے۔اب جوآپ نے مجھے زندگی دی ہے۔وہ مجھے دوزخ کا ایندھن بنادے گی۔آپ نے مجھ سے کیوں کھلواڑ کی۔کیا ملا آپ کو۔آپ تو چین سے جی لیں گے۔لیکن مجھے چین سے جینے نہیں دیں گے۔شادی سے پہلے میں اپنی اندر کی عورت کوتھپک تھپک کرسلاتی رہی ہوں۔آپ نے اسے جگادیا ہے۔اب مجھے اس کا گلہ گھونٹنا ہی پڑے گا۔اس کے سوائے میرے لیئے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔''بات ختم کرتے کرتے اس کی سانس تیز ہوگئی۔اوروہ آنکھیں پونچھتے ہوئے لیٹ گئی۔

صبح صنوبر کی آنکھ کھلی تو ببو سامنے کھڑا تھا۔آنکھیں ملتے ہوئے اس نے ببو سے پوچھا۔

''کیابات ہے ببو؟''

''میں تمھیں کب سے آواز دے رہا ہوں آنٹی۔'' ببو نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

'' داداجان نے کہا ہے کہ آج ناشتہ تمھارے ساتھ کریں گے۔وہ تمھیں بلارہے ہیں۔'' ببو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو چل میں ابھی آتی ہوں۔" صنوبر نے کپڑے درست کرتے ہوئے کہا اور دونوں کمرہ سے باہر نکل گئے۔ بابا ناشتہ پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ کمرہ میں داخل ہو کر ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ بابا نے اسے غور سے دیکھا اور خاموشی سے ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگے۔ وہ بار بار صنوبر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے اِس طرح دیکھنے پر اس نے دو بار پہلو بدلا اور نظریں نیچی کیئے چائے پینے لگی۔ بابا نے کھنکار کر کہا۔

"صنوبر۔"

"جی بابا؟" اس نے کمزور لہجہ میں کہا۔

"کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں تم بجھی بجھی سی لگ رہی ہو۔ کیا بات ہے۔ کیا جمیل نے کچھ کہا تم سے؟"

مجھے کچھ کہنے کے لیئے ان کے پاس ہے ہی کیا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا اور آہستہ سے جواب دیا۔

"نہیں بابا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یوں ہی طبعیت ذرا مضمحل تھی۔ اب ٹھیک ہے۔"

"دیکھو صنوبر! یہ گھر تمھارا ہے۔ تم اس بڑے گھر کی بہو ہو۔ ہنستے ہنساتے رہو۔ تمھاری خوشی ہماری خوشی ہے۔ تمھارے آنے سے

پہلے یہ بنگلہ اجڑی ہوئی حویلی لگتا تھا۔تمھارے آنے سے اس میں رونق آ گئی ہے۔اور ببو نے اس ویران گھر کو نئی زندگی دی ہے۔'' بابا نے خوش ہو کر ببو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

بابا کے ساتھ وہ بھی دھیرے سے مسکرادی ۔ لیکن اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے کرب نے اسے اندر سے مسوس کر رکھ دیا اس نے دل ہی دل میں بابا سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں تمہارے گھر میں بہت خوش ہوں بابا۔۔۔ بہت خوش۔۔۔اتنی خوش کہ کبھی بھولے سے بھی خوشی میرے سامنے آ جائے تو میں اسے پہچان بھی نہیں سکوں گی۔ آپ کا یہ خوبصورت بنگلہ میری خوشیوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا مدفن ہی تو بن گیا ہے۔آپ کے یہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرے لیئے کچھ نہیں ہے۔۔سوچتے سوچتے اس نے پانی کا گلاس اٹھالیا۔بابا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

'' یہ کیا صنوبر چائے پر پانی پی رہی ہو؟'' تم نے کچھ کھایا بھی نہیں۔آخر کس الجھن میں ہو؟''

اس نے گھبرا کر گلاس رکھ دیا اور کھسیانی ہو کر کہا۔

"بات کچھ بھی نہیں ہے بابا۔۔۔دراصل آپ کو دیکھ کر مجھے بابا کی یاد آجاتی ہے۔" صنوبر نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

بابا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلو ذرا باہر گھوم آئیں۔" پھر ببو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ببو ڈرائیور سے کہنا گاڑی باہر نکالے۔ میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں۔ اور ہاں صنوبر تم اور ببو بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

بابا اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اس نے نیم گرم آنسوؤں کو جو پلکوں پر آ کر رُک گئے تھے جلدی سے پونچھا اور ببو کو لے کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

صنوبر کو یک گونہ سکون خسر کے برتاؤ اور رویہ سے مل رہا تھا۔ وہ اسے بہت چاہنے لگے تھے۔ نہ صرف اسے بلکہ ببو کو بھی حرز جان بنائے ہوئے تھے۔ ببو بھی ان سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ ویسے جمیل بھی ببو کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے لیئے نئی نئی چیزیں اور کپڑے خرید لاتا تھا۔ لیکن بابا کے چاہنے کا انداز ہی کچھ نرالا تھا۔ صنوبر کو خسر کے روپ میں

جیسے اس کے بابا مل گئے تھے۔ وہ انھیں بابا ہی کہنے لگی تھی۔ وہ اپنے بابا کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اور کبھی کبھی ان سے خفا بھی رہتی تھی کہ وہ اس کے لیئے کچھ کرتے نہیں تھے۔ انھیں بس اپنی ہی فکر تھی کہ وہ اگر پرائے گھر چلی گئی تو ان کا کیا ہوگا۔ پھر بھی وہ اس کے اپنے بابا تھے وہ ان سے دل برداشتہ ہو کر بھی ہر طرح سے ان کا خیال رکھتی تھی۔ ان کی ہر خواہش پوری کر کے انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ نئے بابا اسے ہر دم اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تھے۔ ساتھ لے کر کھاتے۔ جب بھی باہر گھومنے جاتے اسے اور بہو کو ساتھ لے جاتے۔ اکثر نئے لطیفے سنا کر ہنستے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے صنوبر کو اپنے قریب کر لیا تھا۔ وہ بھی انھیں دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔

وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے سراپا کو دیکھ رہی تھی کہ ڈرائنگ روم سے جمیل کی آواز آئی۔

"صنوبر ذرا ادھر آنا۔"

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

''رک کیوں گئیں۔ادھر آؤ بھئی۔'' جمیل نے کھلتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

'' اس سے ملو یہ میرا دوست ہے سمیر۔''

'' آداب عرض ہے بھابی۔'' سمیر نے میٹھے لہجہ میں کہا۔

'' آداب۔'' صنوبر نے شرماتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

'' صنوبر۔ یہ میرا بہت عزیز ترین دوست ہے۔ بے حد مخلص ہے۔'' جمیل نے فخریہ انداز میں کہا۔

'' ارے بھئی بھابی کو بیٹھنے کے لیئے بھی نہیں کہو گے۔'' سمیر نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

''بیٹھو نا بھابی۔'' پھر خود ہی اس نے صنوبر سے بیٹھنے کے لیئے کہا۔

'' آپ بیٹھیئے۔میں چائے لے آتی ہوں۔'' وہ جلدی ہی کمرہ سے نکلنا چاہ رہی تھی۔

'' صنوبر، تم بیٹھو ، چائے آجائے گی۔'' جمیل نے اسے

مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

" حلیمہ۔ کافی لے آؤ۔ اور کچھ کھانے کے لیئے بھی لے آنا۔" جمیل نے بلند آواز سے کہا۔

" بھابی۔ یہ جمیل ہے نا۔ یہ آپکی بہت تعریف کرتا رہتا ہے۔۔اور واقعی آپ ہیں بھی تعریف کے قابل۔" سمیر نے شریں لہجہ میں کہا۔

وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔ اور ایک نظر سمیر کو دیکھکر چپکے سے مسکرا کر رہ گئی۔ سمیر نے تھوڑے توقف سے پھر کہا۔

" بھابی اسے کھونٹے سے باندھ کر رکھیئے۔ شادی سے پہلے یہ جہاں گرد کی طرح گھوما کرتا تھا۔ آج دلی میں ہے تو کل بمبئی میں اور پرسوں کلکتہ میں۔۔۔ خیال رکھیئے۔ ورنہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

" کیوں جھوٹ بک رہا ہے۔ تو آخر سچ بولنا کب سیکھے گا۔" جمیل نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اوپری ناراضگی سے کہا۔

" ہتھے سے کیوں اکھڑ رہا ہے بھئی۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ بلاؤں ابا جان کو؟" سمیر نے اس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی جانے دے کیوں بگڑ رہا ہے۔ لے کافی پی اور جو من میں آئے سیر ہوکر کھالے۔" جمیل نے کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں صرف کافی پیوں گا۔" سمیر نے صنوبر کی طرف پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجیئے بھابی۔"

"شکریہ۔" صنوبر نے پیالی لیتے ہوئے اسے ممنویت سے دیکھا۔

کافی پیتے ہوئے صنوبر نے ایک دوبار سرسری نظروں سے سمیر کو دیکھا۔ کہتے ہیں چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے اس نے اندازہ لگایا کہ سمیر اچھا انسان لگتا ہے۔ چہرہ سے شرافت ٹپکتی ہے۔ پھر اس نے جمیل کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ آپ ہی آپ کچھ سوچتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اس کا اس طرح بے موقع مسکرانا صنوبر کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ ویسے بھی جمیل کے تعلق سے اس کے دل میں گرہ پڑگئی تھی۔ کیوں

کہ اس نے صنوبر کی زندگی اجاڑ دی تھی۔ ماں بننے کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ جمیل کے لیئے اس کے دل میں کہیں بھی نرم گوشہ نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر صنوبر کے دل میں چبھن سے ہوتی تھی۔ کبھی سوچتی کہ موجودہ زندگی سے سمجھوتہ کر لے۔ اور کبھی سوچتی کہ جمیل سے قطع تعلق کر لے۔ کیا حاصل ہے ایسی زندگی سے۔ جب بھی وہ فیصلہ کرنے کے قریب ہوتی۔ بابا اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے۔ اگر بابا نے اسے اپنے پیار میں باندھ نہ لیا ہوتا تو کبھی کی بغاوت کر بیٹھتی۔ کیوں کہ جمیل نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ اور وہ زخموں کی ٹیس سے کراہ رہی تھی۔ زخم بھی ایسے جو زندگی بھر خون اگلتے رہیں اندر کی عورت اسے چین سے رہنے نہیں دیتی تھی۔ ہمیشہ اسے کچوکے دیتی رہتی تھی۔ اور آخری قدم اٹھانے کے لیئے اسے اکساتی رہتی۔۔ پھر بابا کا پلڑا بھاری ہو جاتا۔ وہ چونکی تو جمیل اس سے مخاطب تھا۔

"صنوبر! کیا سوچ رہی ہو بھئی۔ سنو سمیر کیا کہہ رہا ہے۔"

"کہیئے سمیر بھائی۔" صنوبر نے الجھی ہوئی سوچوں کو مقفل کرتے ہوئے پوچھا

''بھابی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کل شام آپ سب لوگ میرے گھر کھانا کھائیں گے۔''

''بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ پہلے ان کی منظوری تو لیجئے۔''صنوبر نے خوش دلی سے کہا۔

''ہمیں تمہاری دعوت منظور ہے۔'' جمیل نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور صنوبر کو میٹھی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سب لوگ دعوت سے لوٹے تو حلیمہ نے صنوبر سے کہا۔

''بی بی جی۔ آپ کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب آئے تھے۔ کہہ رہے تھے آپ سے ملنا ہے۔''

''پھر کیا کہا تم نے ان سے؟''صنوبر نے ببو کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

'میں نے کہا کہ دعوت میں گئے ہیں۔ شاید دیر سے لوٹیں گے۔''

''کچھ کہا انہوں نے؟''

''جی نہیں۔''

''اچھا۔''

''چلو ببو چل کر آرام کرتے ہیں۔'' داداجان نے کمرہ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

ببو نے صنوبر اور جمیل کو ٹاٹا کہا اور داداجان کے ساتھ چلا گیا۔

صنوبر نے گردن موڑ کر جمیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سمیر بھائی کے دونوں بچے بہت اچھے ہیں۔''

جمیل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں اس نے صنوبر کی بات سنی تھی یا نہیں ۔اس کے چہرہ پر کوئی ردِ عمل نہیں تھا۔ اس کا چہرہ سفید کورے کاغذ کی طرح لگ رہا تھا۔ صنوبر شب خوابی کا لباس پہن کر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور ذرا اُنچی آواز میں کہا۔

''آپ نے سُنا نہیں میں نے کیا کہا!''

''ہاں واقعی سمیر کے بچے بہت اچھے ہیں۔'' جمیل نے چونکتے ہوئے کہا۔

جمیل کا جواب سن کر صنوبر کو اپنے منہ میں کڑواہٹ کا احساس ہونے لگا اس کی طبیعت نیچے اُوپر ہو رہی تھی۔ دل میں چبھن سے ہونے لگی تھی۔ جمیل کا چہرہ اسے دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ جمیل نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''میں کپڑے تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔''

صنوبر چپ چاپ کھڑی رہی۔ سمیر کے بچے اس کی ممتا کے گرد آلود کواڑ پر دستک دے رہے تھے۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کی خالی کوکھ میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ چھاتیوں میں تھرتھراہٹ ہونے لگی۔ جمیل کپڑے تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ گیا۔ اور صنوبر سے ڈگمگاتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''یہاں آؤ صنوبر۔ کھڑی کیوں ہو؟''

''سوچ رہا ہوں کہ میں بھی کتنا مجبور ہوں کہ تمھارے زخموں پر مرہم بھی نہیں رکھ سکتا۔'' جمیل کے لہجہ میں اداسی تھی۔

''میری قسمت میں ماں بننا نصیب نہیں۔ یہ احساس مجھے

چین سے جینے نہیں دے گا۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا جمیل !۔'' صنوبر نے مایوسی سے کہا۔اس کے گالوں میں آتش دان جل بجھ رہے تھے۔

'' ہاں صنوبر واقعی میں تمھارا مجرم ہوں۔تم جو چاہو مجھے سزا دو۔'' جمیل نے شرمسار ہو کر کہا۔

''میں کیا آپ کو سزا دوں گی۔سزا تو آپ نے مجھے دی ہے۔ عمر قید!'' صنوبر نے تلخی سے کہا۔

جمیل نے شرم سے گردن جھکا دی۔وہ اوپر نظر اُٹھا نہیں پا رہا تھا۔کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ندامت سے کہا۔

'' مجھے اور شرمندہ مت کرو صنوبر۔خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔میری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔اگر پپا نہ ہوتے تو میں کبھی کا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر کیا دکھ ہو گا کہ میں تمھیں بچہ نہیں دے سکتا۔میری وجہ سے تم بے اولاد ہونے کا عذاب جھیل رہی ہو۔ میں ۔۔۔کوشش کروں گا کہ تم کو اس عذاب سے نجات ملے۔''

صنوبر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ جمیل ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ پھر خود بھی اس کے بازو لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہیڈ ماسٹر کرسی سے اُٹھ ہی رہے تھے کہ صنوبر کمرہ میں داخل ہوئی

''آداب عرض سر۔''

''ارے صنوبر۔ آؤ بیٹی بیٹھو۔'' ہیڈ ماسٹر اسے دیکھ کر کھل اُٹھے۔

''آپ کہیں جا رہے تھے سر؟'' صنوبر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بس ایسے ہی ذرا اسکول کا راونڈ لینے جا رہا تھا۔ خیر، سناؤ کیسی ہو تم؟'' ہیڈ ماسٹر نے اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھی ہوں کل رات دعوت سے آنے پر معلوم ہوا کہ آپ آئے تھے''

صنوبر نے ٹیبل پر کہنی ٹیکتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ دو چار روز سے تمھاری بہت یاد آ رہی تھی۔ جی چاہا کہ تمھیں دیکھ آؤں۔'' ہیڈ ماسٹر نے والہانہ انداز سے کہا۔

''آپ کو میرا کتنا خیال ہے سر!'' صنوبر نے جذباتی ہو کر کہا۔

''صنوبر کیا تم واقعی خوش ہو؟'' ہیڈ ماسٹر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا

''اور نہیں تو کیا۔ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ کیا مجھے دیکھ کر ایسا نہیں لگتا؟'' صنوبر نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اندر کا کرب آنکھوں میں اتر آیا۔

''صنوبر! کہتے ہیں چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ تمھارے چہرہ کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ تم واقعی خوش ہو۔'' اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے صاف صاف بتاؤ۔ شاید میں کچھ کر سکوں۔ میں نے تمھیں بیٹی کہا ہے نا۔ بیٹی کی پریشانی کا احساس باپ کو نہیں تو اور کسے ہوگا۔ ہیڈ ماسٹر نے فکر مند لہجہ میں کہا۔

”سر میرے درد کا علاج آپ کیا کسی کے بھی پاس نہیں ہے۔
یہ دکھ اکیلے ہی جھیلنا ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ میں۔۔۔؟ نہیں! آپ
کو بتا کر میں زندگی بھر آپ کو دُکھ میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔ آپ سن کر
برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔۔ اس کا جی
چاہا کہ منہ بولے باپ سے لپٹ کر خوب روئے۔ لیکن اس نے انھیں
میٹھی نظروں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں بابا! واقعی میں بہت خوش ہوں۔ آپ میری کوئی فکر نہ
کریں۔ ببو بھی بہت خوش ہے۔ اتنا خوش کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔“

”خدا کا شکر ہے!۔۔۔ ارے ہاں صنوبر تمھارا استعفیٰ منظور
ہو گیا ہے۔ تمھارے گھر آنے کا مقصد تمھیں اس کی اطلاع دینا بھی
تھا۔۔۔ آؤ ذرا اسکول کا ایک راونڈ لیتے ہیں۔“ انھوں نے اُٹھتے
ہوئے کہا۔

”چلیئے۔“ صنوبر نے انھیں میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آتی رہو۔ دوبارا جب آؤ گی تو ببو کو بھی ساتھ لیتے آنا۔“

ہیڈ ماسٹر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''ضرور لاؤں گی۔'' صنوبر نے اثبات میں کہا۔

مکان میں داخل ہو کر جمیل نے صنوبر کو آواز دی۔ اسے کوئی جواب نہں ملا تو اس نے حلیمہ سے پوچھا۔

''حلیمہ صنوبر کہاں ہے۔''

''اوپر ہیں۔'' حلیمہ نے سر پر پلو رکھتے ہوئے کہا۔

''پپا اور ببو؟''

''دونوں باہر گئے ہیں۔'' حلیمہ باورچی خانہ کی جانب پلٹی اور جمیل اوپر چڑھ گیا۔ صنوبر بال سنوار رہی تھی آئینہ میں جمیل کا عکس دیکھ کر بال ویسے ہی کھلے چھوڑ دیئے۔ جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے صنوبر۔''

''کیسی خوشخبری؟'' صنوبر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں نے اُوٹی جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ پپا سے اجازت لے کر ہم پرسوں روانہ ہو جائیں گے۔''

صنوبر نے خاموشی سے سنا۔ کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

''کتنے دن کا پروگرام ہے۔''

''جب تک تم چاہو'' جمیل نے اسے گدگداتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا کرتے ہیں؟'' گدگدی سے وہ دوہری ہوگئی۔ اور منہ میں ساری کا پلو دبائے نیچے اتر گئی۔

جمیل نے اپنی بات ختم کی تو بابا نے صنوبر کو دیکھ کر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی ہنی مون کا جو تم نے پروگرام بنایا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ ضرور جاؤ۔

لیکن ببو کو یہیں رہنے دو۔ میرے پاس میرا اکیلے میں دل کیسے لگے گا۔ تم لوگ واپس آنے کے بعد میں اور ببو شملہ جائیں گے۔ کیوں ببو ٹھیک ہے نا؟'' بابا نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

جمیل نے پلٹ کر صنوبر کی جانب دیکھا۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی۔ ببو اس کے قریب آ کر کہنے لگا۔

''کب جا رہے ہیں آپ لوگ آنٹی؟''

صنوبر نے اسے قریب لے کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''پرسوں۔تم دادا جان کو پریشان تو نہیں کرو گے؟''

''نہیں آنٹی ۔ پر جلدی واپس آ جانا۔'' ببو نے اس کے کان کھنچتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹے ،جلد ہی آ جائیں گے۔'' جمیل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اچھا دادا جان ، آنٹی انکل ۔ میں اسکول جا رہا ہوں۔'' ببو نے ٹیبل سے بستہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے آفس جانا ہے۔ببو چلو تمہیں اسکول چھوڑ دیتا ہوں۔''

جمیل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

اُوٹی پہنچ کر وہ ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرے۔صنوبر سامان کمرہ میں سلیقہ سے رکھ کر نہانے کے لیئے حمام میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ کال بیل بجی۔

''ذرا دیکھنا تو کون ہے؟'' اس نے حمام میں جاتے ہوئے جمیل سے کہا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ جمیل نے دروازہ کھولا تو سمیر سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر جمیل نے گرم جوشی سے کہا۔

''ارے سمیر کب آئے تم؟ میں سوچ رہا تھا شاید کل تک پہنچو گے۔''

دونوں ایکدوسرے کا ہاتھ تھامے آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ کافی دیر تک آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے۔ صنوبر نہا کر حمام سے باہر نکلی۔ سامنے کرسی پر سمیر کو دیکھ کر اسے سخت اچنبھا ہوا۔ ایک ساتھ کئی سوالات اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے۔ سمیر بھائی اچانک کیسے آ گئے۔ جمیل نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اکیلے آئے ہیں یا بیوی بچے بھی ساتھ ہیں عجیب اتفاق ہے؟۔ ان کے پروگرام کے بارے میں جمیل کو مجھ سے کہنا چاہیئے تھا۔ یہ کیا معمہ ہے۔ اس طرح اور بھی کئی سوالات اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے۔ دونوں کو ایک ساتھ پرزور قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا

تھا۔ وہ آہستہ سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور سمیر کو نپے تلے انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کب آئے سمیر۔ کیا بھابی اور بچے بھی آئے ہیں؟''

''وہ میکے گئی ہوئی ہیں۔'' سمیر نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟'' صنوبر نے تجسس سے پوچھا۔

''اسی ہوٹل میں۔ آپ کے سامنے والے کمرہ میں۔'' سمیر نے بے دلی سے کہا۔

''صنوبر، تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ذرا باہر گھوم آئیں۔'' جمیل نے درمیان میں کہا اور سمیر سے دوسری باتوں میں مصروف ہو گیا۔

جب سے وہ اوٹی آئے تھے۔ جمیل کے رویہ میں تبدیلی آ رہی تھی۔ صنوبر اور سمیر میں بے تکلفی اور قربت بڑھانے کے لیئے وہ مواقع تلاش کر رہا تھا۔ کہیں باہر گھومنے جانا ہو تو اپنی طبیعت کی گرانی کا بہانہ کر کے پلنگ پر لیٹ جاتا۔ یا کوئی دوسرا بہانہ کرتا اور دونوں کو

باہر جانے کے لیئے کسی نہ کسی طرح مجبور کر دیتا۔صنوبر اس کے رویہ کا جائزہ لے رہی تھی ۔سمیر تو اس کی بات مان لیتا۔لیکن صنوبر کچھ اس انداز سے ٹالنے کی کوشش کرتی کہ سمیر کو کہیں ناگوار نہ گذرے۔اور اس کے پس و پیش کو صرف جمیل ہی محسوس کر سکے۔۔پھر بھی وہ جمیل کی بات رکھنے کے لئے مجبوراً سمیر کے ساتھ گھومنے چلی جاتی ۔سمیر باتونی تو تھا ہی۔وہ اس کی دلچسپ باتوں سے محظوظ ہونے لگی تھی۔اور رفتہ رفتہ اس کی بے کلی کا بوجھ بھی ہلکا ہونے لگا تھا۔اوٹی کے حسین اور خوبصورت قدرتی مناظر،خوشگوار آب و ہوا کے اثر سے صنوبر تروتازہ پھول کی طرح کھلنے لگی۔اس نے جمیل کے رویہ اور حیلے بازی کو درگذر کر دیا۔سمیر کے ساتھ گھومنا پھرنا اب اسے اچھا لگ رہا تھا۔ دونوں نے اُوٹی کے خاص اور اہم مقامات دیکھ ڈالے۔سمیر کے ساتھ رہ کر وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔وہ بالکل کھلی کتاب کی طرح تھا۔اس نے کبھی ایسی ویسی بات نہیں کی ۔وہ صنوبر کا بہت احترام کرتا تھا۔وہ اس کے برتاؤ اور اخلاص پر بہت مطمئین تھی۔جمیل

میں بڑھتی ہوئی بے تکلفی اور قربت کو دیکھتے ہوئے مسرور تھا کہ یہی سلسلہ روز و شب جاری رہا تو وہ لوگوں کی تیکھی نظروں کے تیروں سے محفوظ ہو جائے گا۔

صنوبر کمرہ میں اکیلی بیٹھی جمیل کا انتظار کر رہی تھی۔ جاتے وقت کہہ کر گیا تھا کہ ایک ضروری کام نپٹا کر جلد ہی لوٹ آئے گا۔ لیکن رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے دل پر کنکر برسا رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ ہوا کے سرد جھونکے سے اس کے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ اس نے فوری کھڑکی بند کر دی اور گرم شال لپیٹ کر کمرہ میں ٹہلنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ اوٹی آنے کے بعد سے جمیل اس سے دور دور کیوں رہنے لگا ہے۔ اور جانے انجانے میں سمیر کو اس سے قریب ہونے کا موقع کیوں دے رہا ہے۔ اس کی سوچ کانٹے کی نوک پر آ کر ٹک گئی۔ اس کے اندر بھونچال سا اٹھنے لگا۔ اور دل کے اندر جمیل کے تعلق سے ایک اور گرہ پڑ گئی۔ اسے اس طرح مجھے بے آبرو نہیں کرنا

چاہئے تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیا اور مجھے جلا کر خاکستر کر دیا۔ کب تک میں اندر سلگتے ہوئے تنور پر پانی کا چھڑکاؤ کرتی رہوں۔ اسے جمیل سے گھن آنے لگی تھی۔ پھر بھی وہ اس سے نباہ کئے جا رہی تھی۔ کبھی صرف ایک رات اس کی زندگی میں آکر ٹھہر گئی تھی۔ جبکہ وہ گہری نیند سو رہی تھی جمیل نے اسے اپنے بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔ اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے تھے۔ وہ بے قابو ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک وہ اسی حالت میں رہے۔ پھر دھیرے دھیرے جمیل کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اور وہ شرمسار ہو کر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ وہ چپ چاپ بے حس و حرکت اسی حالت میں پڑی رہی۔ اسی طرح جاگتے ہوئے رات کاٹ دی۔ جمیل نے اس کو سوئے ہوئے جذبات میں اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ وہ کنویں کے پاس رہ کر بھی پیاسی تھی۔ اور کئی دنوں تک سنبھل نہیں سکی تھی۔ بڑی مشکل سے بدن کے آتش دان کو ٹھنڈا کر سکی تھی۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی کہ اچانک کال بیل بجی اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بج

رہے تھے۔ پیچ وتاب کھاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔اور سمیر کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔اس نے سمیر کو نیچے سے اوپر تک دیکھا ۔ایک سرد لہر سارے بدن میں کانٹے چبھو گئی۔اس نے سہم کر پوچھا۔

''آپ؟''

سمیر کوئی جواب دیئے بغیر سیدھا کمرہ میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔صنوبر یوں ہی دروازہ میں کھڑی سمیر کو دیکھتی رہی۔ پھر کچھ سونچ کر دروازہ بند کر کے اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نظریں جھکا دیں۔ کمرہ میں گہری خاموشی تھی۔صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی

دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے سے کترا رہے تھے۔صنوبر سوچ رہی تھی کہ سمیر آج کچھ بدلا بدلا سا نظر آ رہا ہے۔سمیر نے چور نظروں سے صنوبر کو دیکھا۔اس کے چہرہ کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدل رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کے تعلق سے وہ کیا سوچ رہی ہے۔کہیں وہ مجھ سے بدگمان نہ

ہو جائے۔ ایک طرف وہ اپنا دامن جلنے سے بچا رہی ہے۔ اور دوسری طرف میں اپنی آبرو سمیٹ رہا ہوں۔ صنوبر کو لگ رہا تھا جیسے وہ سمیر سے پہلی بار مل رہی ہے۔ یا جیسے پہلی بار اچانک سمیر کا اس سے آمنا سامنا ہو گیا ہے۔ اس نے کن انکھیوں سے سمیر کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے اِس طرح بیٹھا تھا جیسے راستے میں لٹ لٹا کر آیا ہو۔ اس نے غیر ارادی طور پر کمرہ کا جائزہ لیا اور سمیر کو الجھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سمیر! کیا آپ کو پتہ ہے جمیل کب تک واپس آئیں گے؟''

سمیر نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''کہہ کر تو گیا تھا کہ جلد واپس آ جائے گا۔''

''جب آپ نے بیل بجائی اس وقت شاید آپکو اندازہ تھا کہ جمیل ابھی لوٹے نہیں ہیں!'' صنوبر نے تیکھے لہجہ میں کہا سمیر کو فوری چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

نیم کشیدہ اور گھٹے گھٹے ماحول میں صنوبر نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

''سمیر بھائی! میں آپ کو غیر نہیں سمجھتی۔ بلکہ اپنا غم گسار، ہمدرد اور مخلص سمجھتی ہوں۔ اس لیئے آج حجاب کے سارے پردے چاک کر کے آپ سے کھل کر بات کرنا چاہتی ہوں۔ واسطہ دیتے ہوئے کہ آج کی بات راز رہے گی۔

سمیر ہکا بکا صنوبر کو دیکھنے لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ عورت اتنا کھل کر بھی سامنے آسکتی ہے۔ وہ کافی دیر تک کشمکش میں مبتلا رہا پھر ذہنی انتشار پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''بھابی! آپ میرے تعلق سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔''

صنوبر نے کاغذ کا ایک پرزہ اسے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ تحریر جمیل کی ہے۔ ان کی اٹیچی کیس سے ملی ہے۔''

سمیر نے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے چہرہ کا رنگ ایک لخت بدل گیا۔ وہ تلملا کر رہ گیا

''تم نے مجھے بھائی کہا ہے صنوبر۔ میں تو پہلے ہی دن سے تم کو اپنی بہن سمجھتا رہا ہوں۔ کیوں کہ مجھے بہن نہیں ہے۔ جمیل سے مجھے ایسی توقع نہیں تھی۔ مجھے دکھ ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی تمھیں اس دلدل سے نہیں نکال سکتا۔ جمیل کی کمزوری سے میں واقف ہوں۔ میں نے اسے منع بھی کیا تھا۔ لیکن باپ کی ضد کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔''

''سمیر بھائی! آپ کو بتادوں۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے بے اولاد ہونے کے عذاب سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کریں گے۔ اب یہاں آکر ہم دونوں کو تنہا چھوڑ کر گھنٹوں غائب ہو جانا۔۔ کیا ہمارے ناموس کو سنگسار کرنا نہیں ہے؟'' صنوبر نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''بھابی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جمیل اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔ اس کی اس حرکت پر میں کبھی اسے معاف نہیں کروں گا۔ دراصل اس نے ہم دونوں کو رسوا اور ذلیل کیا ہے۔ میں صبح ہونے سے پہلے

یہاں سے چلا جاوں گا۔اب میں اسے کبھی اپنی شکل نہیں دکھاوں گا۔"
اچھا اب دروازہ بند کر کے اطمینان سے سو جاؤ" سمیر نے گلوگیر آواز میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

صبح آٹھ بجے جمیل کمرہ میں داخل ہوا تو صنوبر نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔"رات تمام کہاں رہے آپ۔ایسا بھی کیا کام تھا۔کم از کم فون ہی کر دیا ہوتا۔"

جمیل نے صنوبر کے جاگتے ہوئے بدن پر بھرپور نظر ڈالی اور اعتذارانہ لہجہ میں کہا۔

"صنوبر، کیا کروں کام ہی کچھ ایسا تھا۔سر کھجانے کی فرصت نہیں تھیں۔ لاکھوں کے سودے کی بات تھی۔ اور پھر۔۔۔سمیر جو تمھارے پاس تھا!"

اس کا آخری جملہ سن کر صنوبر کو لگا جیسے ایک سنسناتا ہوا تیر اس کے دل میں پیوست ہو گیا ہے۔اندر ہی اندر اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کے سراپا میں نفرت کا جذبہ سرایت کر گیا۔اس کے جی میں آیا کہ

جمیل کو ننگا کر کے خوب ذلیل کرے۔ لیکن وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اور تلخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں تھا۔ کھٹکا تھا تو صرف آپ کے آنے کا۔ کیوں کہ سمیر رات تمام یہیں تھے!''

جمیل صنوبر کی بات کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے واپس لوٹ گیا اور اپنی سوچ کی کھڑکیوں کو تیزی سے بند کرلیا۔ صنوبر نے حمام میں جاتے ہوئے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''ہم آج ہی واپس جائیں گے۔''

واپس گھر آکر وہ سیدھا بابا کے کمرہ میں گئے صنوبر نے قریب جا کر انھیں سلام کیا تو انھوں نے اسے سینہ سے لگا لیا۔ ان کے سینہ سے لگ کر وہ سوچنے لگی کہ کتنی ٹھنڈک ہے بابا کے سینہ میں۔ بڑی دیر تک وہ اسے سینہ سے لگائے رہے۔ اور بو اس سے لپٹا کھڑا رہا۔ پھر انھوں نے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے حلیمہ سے چائے لانے کے لیئے کہا۔۔

چائے پیتے ہوئے انھوں نے صنوبر سے سفر کی تفصیل پوچھی۔ چائے

کی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے صنوبر نے بڑی خوش اسلوبی سے دلچسپ انداز میں جمیل کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے سفر کی روائیداد سنائی۔ جمیل صنوبر کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ضروری کام کا بہانہ کر کے بابا سے اجازت لے کر باہر نکل گیا۔

صنوبر جب سے اُوٹی سے واپس آئی تھی بابا کی چاہت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ بابا کی بڑھتی ہوئی شفقت کو دیکھ کر اس کے دل کے اندر جو کاجل کی کوٹھڑی بن گیا تھا۔ اب روشنی ہونے لگی تھی۔ چہرہ پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اسے اتنا اطمینان ہورہا تھا کہ اس گھر میں کوئی تو ہے اسکا ہمدرد، مونس، اور غم گسار۔ وہ جمیل سے جتنی دور ہوتی جارہی تھی۔ بابا اتناہی اس کے قریب آرہے تھے۔ ان کا ہر کام وہ بڑی خوشی سے دلجوئی سے کرنے لگی تھی۔ جتنا کہ اپنے بابا کا بھی شاید نہیں کیا ہوگا۔ جمیل سے اسے سخت نفرت ہونے لگی تھی۔ اوٹی سے واپس آنے کے بعد سے اسے جمیل کی صورت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی زندگی کے ایک کنارے پرنفرت تھی۔ اور دوسرے کنارے پر محبت

اس نے جمیل کے کمرہ میں سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بنگلہ کافی وسیع و عریض تھا۔ صنوبر اور جمیل کے الگ الگ کمروں میں سونے کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ دونوں کے درمیاں خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ جمیل اپنے کاروبار کے سلسلہ میں زیادہ تر باہر ہی رہنے لگا تھا۔ کیوں کہ وہ صنوبر کے سامنے اپنی ذلت برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

جمیل دو دن سے دہلی گیا ہوا تھا۔ ببو اسکول کی ٹرپ پر اجنتہ گیا ہوا تھا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرہ میں پلنگ پر لیٹ کر ناول پڑھ رہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب بابا نے دروازہ پر دستک دی۔ حالانکہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صنوبر نے کتاب بند کر کے دروازہ کی طرف دیکھا۔ بابا کو کھڑا دیکھ کر وہ تیزی سے اُٹھ بیٹھی۔ اور انھیں اِحترام سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آیئے نا بابا۔ وہاں کیوں کھڑے ہیں۔''

بابا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ ٹیبل پر رکھے ناول کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور صنوبر سے گمبھیر لہجہ میں کہا۔

''صنوبر، ایک بات پوچھوں؟''

''کیا پوچھنا چاہتے ہیں بابا۔'' صنوبر نے کھلے ہوئے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے کہا۔

''صنوبر! میں ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ تم یہاں خوش نہیں ہو۔ اور یہ بات مجھے اندر ہی اندر کتر رہی ہے۔ سچ بتاؤ کیا تم جمیل سے خوش ہو؟'' بابا کی آواز بھاری سی تھی۔

''میں بہت خوش ہوں بابا۔ آپ کو دیکھ کر تو مجھے۔۔۔۔''

بابا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسا لگتا نہیں۔''

صنوبر خاموش رہی۔ مزید جھوٹ بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''بات یہ ہے صنوبر کہ کچھ چیزیں انسان کے بس میں ہوتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتیں۔۔۔۔ جمیل شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے شادی کے لیئے مجبور کیا تا کہ اس گھر میں چراغ سے چراغ

جلتا رہے۔اس کے انکار کی وجہ میرے لیئے جان لیوا تھی۔ بہر صورت اس گھر میں چراغ کو روشن ہونا ہی ہے۔۔تمھارا کیا خیال ہے صنوبر؟''

''میں آپ کے درد کو سمجھتی ہوں بابا۔لیکن میں آپکی بات کا کیا جواب دوں۔۔کوئی اپنے گھر کو بے چراغ نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی مٹے ہوئے الفاظ کی طرح ہوتی ہے۔میں۔۔۔میں۔۔۔۔''

''تو تم مجھ سے اتفاق کرتی ہونا؟'' بابا نے زمین سے اوپر اٹھتے ہوئے کہا۔وہ سر جھکائے خاموش رہی۔ بابا نے ایک بار اسے نیچے سے اوپر دیکھا۔پھر یکا یک روشنی گل کر دی۔

صبح کی چائے لے کر حلیمہ نے صنوبر کے دروازہ پر کافی دیر تک دستک دی۔ پھر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا اور ایک چیخ کے ساتھ چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

صنوبر کی لاش چھت کے پنکھے سے لٹک رہی تھی۔اور دوسری جانب صوفے پر خون میں لت پت بابا کی لاش پڑی تھی۔

☆☆☆☆۔۔۔۔۔۔ختم شد۔۔۔۔۔۔☆☆☆☆
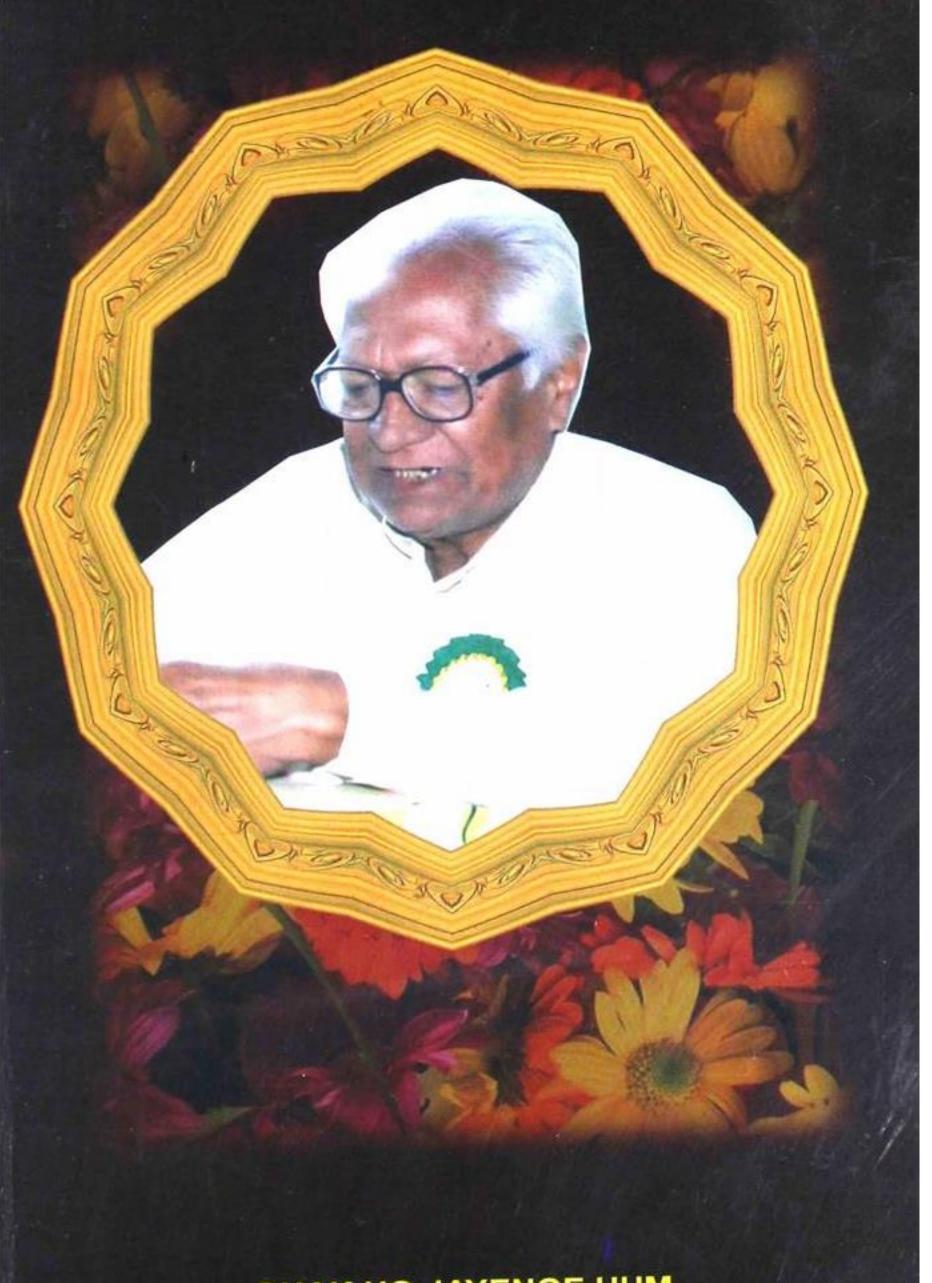
QHAK HO JAYENGE HUM

(Navel)

By

Ibrahim Akhtar

Yousuf Colony,Parbhani-431401